رنگِ حیات

محمد رشی الدین احمد امجد

رنگِ حیات

محمد شفیع الدین احمد امجد



محمد بشیر الدین احمد امجد

امجد یہ کیسا راز ہے کس کا ہے یہ کرم
کس نے قلم میں طاقتِ بے اختیار دی

سنِ اشاعت	جولائی سنہ ۱۹۸۹ء
بار اوّل	۵۰۰
کتابت	حافظ حلیم امجدؔ
ترتیب و تزئین	جناب خواجہ شوقؔ صاحب
طباعت	اعجاز پرنٹنگ پریس۔ حیدرآباد ۔ ۲
ڈیزائن سرورق	قیصر سرمست
طباعت سرورق	فاضل پریس محبوب نگر
قیمت	۱۸ (اٹھارہ روپے)

ناشر : ڈاکٹر محمد ممتاز الدین احمد ایم بی بی ایس، اے ایم پی ایچ ڈی
صدر اناٹمی ڈیپارٹمنٹ ۔ ملایا یونیورسٹی ۔ کولالمپور

کتاب ملنے کے پتے

۱. بشیر امجد نزد ڈاکٹر ایم ۔ اے ۔ غنی کلینک 5-7-284 E
چار قندیل ۔ آغا پورہ ۔ حیدرآباد 5-7-237

۲. حسامی بک ڈپو ۔ مچھلی کمان ۔ حیدرآباد

۳. عظیم منشن 77/86 ۔ 4 ۔ 9 سالار جنگ کالونی ۔ حیدرآباد
فون نمبر: 253034

اِنتساب

میں اپنی ان شعری کاوشوں کو اپنی رفیقِ حیات
"محترمہ ریاست النسأ بیگم صاحبہ (مرحومہ)" کے نام
معنون کرتا ہوں۔

جن کی یادوں میں میری شاعری کی حیات پوشیدہ ہے۔

پھول یادوں کے، گہر اشکوں کے، ماضی کی کسک
زندگی میرے لئے ڈھونڈھ کے کیا لائی ہے

محمد بشیر الدین احمد امجد

ترتیب و تزئین

تخلیقات

کچھ اپنے بارے میں

میرا نام محمد بشیر الدین احمد ہے۔ اور امجد تخلص ہے۔ میں نے ایک ادبی گھرانے میں ضلع محبوب نگر کے ایک موضع آکور میں ۱۹۲۰ء میں اپنی آنکھیں کھولیں۔ معاملۂ ملازمت میں محکمہ مارکٹنگ سے وابستہ رہا اور ۱۹۷۵ء میں بحیثیت مہتمم مارکٹنگ وظیفہ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوا۔ جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے اتنا کہا جا سکتا ہے والد مرحوم محمد برہان الدین احمد صاحب کی ملازمت کے سبب میری پرائمری تعلیم کا آغاز ضلع کریمنگر سے ہوا اور ثانوی تعلیم کی تکمیل ہنمکنڈہ ہائی اسکول ورنگل سے ہوئی۔ ۱۹۳۶ء میں میں نے میٹرک درجۂ دوم میں پاس کیا جب میں آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا اس وقت سے ہی مجھے اردو ادب سے دلچسپی تھی اور اکثر اسکول کے جلسوں اور پروگراموں میں حصہ لیا کرتا تھا میرے بڑے بھائی جناب محمد فصیح الدین احمد صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔ ریٹائرڈ ایڈیشنل سشن جج اور میری بھاوج محترمہ عظیم النساء بیگم صاحبہ جو ادبی اور شعری ذوق رکھتے ہیں کی مشفقانہ رہبری نے میری ادب دوستی کو پروان چڑھایا۔ مزید برآں میری بھتیجی انجم سوز اور میرے داماد ڈاکٹر قمر الدین صاحب قمر کی ادبی سرگرمیوں نے میرے ذوق کو ابھارنے میں سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

میں اس کا اظہار کئے بغیر رہ نہیں سکتا کہ میری طالب علمی کے زمانہ میں ایک حسین حادثہ پیش آیا۔ جس نے مجھے فنِ شاعری کی طرف مائل کیا۔ وہ یہ کہ جب میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا ہائی اسکول کی جانب سے حضرت جگر مراد آبادی کو ایک مشاعرہ میں مدعو

کیا گیا۔ اس شہنشاہ غزل کے انفرادی خصوصیات کے حامل کلام اور انکے خاص ترنم نے مجھے مثبت انداز میں حد درجہ متاثر کیا۔ دوسرے دن وہ میرے مہمان رہے یوں کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا کہ اس ملاقات اور دن بھر کی رفاقت نے میرے قلب و ذہن میں شعر گوئی کی ایک تحریک بیدار کی۔ پھر دوسرے اساتذہ کے تخلیقات کے مطالعہ کا سلسلہ چل پڑا۔ غزل زندگی کا حقیقی عکس و آئینہ ہوتی ہے۔ دل کی پوشیدہ چنگاریوں اور دبے جذبات کو منظر عام پر لانے کیلئے مجھے غزل سے بہتر کوئی اور ذریعہ نظر نہ آیا۔ اور میں نے اپنے میلانِ طبع کے اعتبار سے اسی صنفِ سخن کو موزوں سمجھا اور اس طرح اپنے احساسات اور جذبات کو اشعار میں ڈھالنے لگا۔

طرز غالبؔ کا، زباں داغؔ کی، مستئ جگرؔ
میرؔ کا درد ملا ہو تو غزل ہوتی ہے

رفتہ رفتہ قلم میں روانی آتی گئی اور فطری و موزوں جذبات کی صحیح عکاسی کرنیوالے اشعار زینتِ قرطاس بنتے گئے اور شوقِ سخن مائل بہ قلم ہوتا گیا۔ ملازمت کی کثیر مصروفیات بھی اِس ذوق میں تعطل نہ پیدا کرسکیں۔ اور جب ۱۹۶۴ء میں محبوب نگر آنا ہوا تو شعر و سخن کی اِس سرزمین کے ماحول اور شعر گوئی کی صحبت نے اس ذوق کو کچھ اور جلا بخشی۔ شیخ محبوب نگری جو میرے دوست اور ایک کہنہ مشق شاعر ہیں ان سے روز و شب ملاقات ہوتی رہی۔ مزید براں محبوب نگر کے ایک نوجوان اور باغ و بہار طبیعت کے مالک شاعر سلیمؔ عابدی جو بزم سخن کے معتمد بھی ہیں کی تحریک اور اصرار پر بزم سخن کے مشاعروں میں بہ پابندی کلام سنانیکا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ پھر کلام کی مختلف اخبارات و رسائل میں طباعت بھی عمل میں آنے لگی۔ جب حیدرآباد منتقل ہوا تو یہاں بھی ادب نواز شعر گو شعر فہم احباب سے روابط بڑھنے

لگے۔ اور خاص طور سے حضرت جناب خواجہ شوق صاحب نے جو ایک استادِ فن اور کہنہ مشق شاعر ہیں اور میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ممتاز الدین احمد کے بچپن کے ساتھی ہیں۔ میری بڑی ہمت افزائی کی اور میرے اس پہلے مجموعہ کلام کی ترتیب و تہذیب کی ذمہ داری قبول فرمائی۔ جس کیلئے میں انکا بہت ہی شکر گذار ہوں۔

بات ادھوری رہ جائیگی اگر میں فاضل پریس محبوب نگر کا تذکرہ نہ کروں جنکے پروپرائٹرس حافظ امجد نے میرے کلام کی کتابت کی، جناب عبدالحئی صاحب بچھڑا اور جناب حکیم حامد صاحب نے میری تخلیقات کو زیور طباعت سے آراستہ کیا۔

اُفقِ طباعت پر میرا یہ مجموعہ کلام جلوہ گر ہو چکا ہے۔ پسند و ناپسند کا حق اپنے قارئین کے حوالے کرتے ہوئے میں اپنی بات ختم کرتا ہوں

بشیر امجد

مکان : 5-7-284/E
آغا پورہ۔ نزد چار قندیل
ڈاکٹر ایم اے غنی کلینک
حیدرآباد۔

3.3.5/8
محلہ مدینہ مسجد
محبوب نگر

پیش لفظ

جناب بشیر امجدؔ صاحب نے ازراہِ لطف اپنے مجموعہ کلام کا مسوّدہ عزیزی انجم قمر سوز صاحبہ کے ذریعہ مطالعے اور اظہار رائے کیلئے بھیجا ۔ میں نے جستہ جستہ اس مسودے کا مطالعہ کیا ۔ امجدؔ صاحب نے غزل کی روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے سادہ اور شیریں انداز میں اپنے جذبات کو شعر کا پیرہن عطا کیا ہے ۔ امجد صاحب نے شعر گوئی کو نہ تو بطورِ فن اختیار کیا ہے اور نہ محض شاعری بقول غالب ان کیلئے ذریعۂ عزت رہی ہے ۔ شاعری کا ذوق اردو کلچر کا ایک لازمہ ہے ۔ اس کلچر میں جو شخص بھی رچ بس جاتا ہے وہ سخن شناس ہونے کیساتھ موزوں طبع بھی بن جاتا ہے ۔ اچھے شعر کی داد دینے کیساتھ خود بھی اچھے شعر کہنے لگتا ہے ۔ ماضی میں پڑھے لکھے مرد ہی نہیں بلکہ خواتین بھی شعر فہمی کا ہی نہیں شعر گوئی کا بھی ذوق رکھتی تھیں ۔ افسوس یہ ہیکہ ان کی تخلیقات خاندانی بیاضوں کی زینت بن کر رہ گیئں اور منظرِ عام پر نہ آسکیں ۔

بشیر امجدؔ صاحب ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر ہیں ۔ ان کے کلام میں جذبات کا خلوص نمایاں ہے جو قاری کو متاثر کرتا ہے ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ۔

بند رکھتے ہیں جو زباں اپنی ؎ ان کا چہرہ کتاب ہوتا ہے

کشتی کے ڈوبنے کا مجھے غم نہیں مگر ؎ ارمان تھا جو موجوں کا وہ تو نکل گیا

نظر جب جھکی تھی تو مایوسیاں تھیں ؎ نظر اب اٹھی ہے تو صرف آسماں ہے

آپ کے پیار کا سہارا تھا ؎ ورنہ دنیا بدل گئی ہوتی

زندگی کے داغ گہرے تھے مگر ؎ دھونے والے آنسوؤں سے دھو گئے

بشیر امجدؔ صاحب کا یہ مجموعہ کلام مجھے امید ہیکہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائیگا ۔

میری نظر میں

اردو شاعری میں صنفِ غزل کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ اس کے مزاج کی دین ہے۔ غزل دراصل اردو شاعری کی بنیاد اور اس کا سرمایہ ہے۔ ہماری شاعری کا خمیر اسی سے بنا ہوا ہے۔ عمر کے لحاظ سے وہ بہت سالخوردہ اور فرسودہ ہی لیکن اس کے گلوری پیکر میں اب بھی جوانی کی آگ موجود ہے۔ یہ واحد صنف ہے جس کی جڑیں ہمارے ماضی کی گہرائیوں میں پیوست ہیں۔ میرؔ سے لیکر فراقؔ و فیضؔ تک غزل نے جو لمبا سفر طے کیا ہے اس میں وہ نشیب و فراز کے کئی مراحل سے گذری ہے۔ آج یہ صنف طوفانی اور عبوری دور سے گزر رہی ہے۔ جس نے غزل گو شعرا کو کئی گروہوں میں بانٹ رکھا ہے۔ ایک گروہ ایسا ہے جو جدیدیت کی پیداوار ہے۔ غزل کو نئے لب و لہجہ سے آشنا کرنے کیلئے نت نئے تجربے کر رہا ہے۔ دوسرا طبقہ جو اعتدال پسند ہے جدیدیت اور قدامت کے درمیان توازن پیدا کرنے کی کوشش میں ہے۔ تیسرا گروہ ایسا ہے جو قدیم روایتی غزل اور اس کی روایات کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ اور روایتی و تقلیدی غزل کی آبیاری میں مصروف ہے۔ بشیر امجد صاحب کا تعلق اسی آخرالذکر گروپ سے ہے۔

یوں تو غزل کی تعبیر و تشریح مختلف طریقوں پر کیجاتی ہے لیکن بنیادی طور پر غزل داستان حسن و عشق اور معاملہ بندی کی شاعری ہے اور اس کے اسی وصف نے قبولیت عام کی سند عطا کر رکھی ہے۔ غزل درحقیقت ایک عشقیہ صنف سخن ہے نغمۂ حسن ہے اور ترانۂ شباب ہے۔ اس کا دامن یوں تو رنگا رنگ پھولوں سے بھرا ہوا ہے لیکن ان میں سب سے زیادہ دلکش وہ پھول ہیں جو حسن و عشق کی خوشبو بکھیرتے ہیں زیرِ نظر شعری

مجموعہ کے شاعر بشیر امجد کی غزلیں ایسے ہی پھولوں سے ہمارے شام جاں کو معطر کرتی ہیں جو رنگ قدیم کی نمائندہ ہیں۔ جناب امجد ہیں تو اسی دور کے شاعر لیکن ان کی وضعداری یہ ہیکہ وہ ماضی سے اپنا رشتہ توڑنا نہیں جوڑنا پسند کرتے ہیں۔ یہی سبب ہیکہ انھوں نے زیادہ تر اپنے آپ کو غزل کے محدود مضامین تک پابند کر رکھا ہے۔ یہی ان کی شاعری کا مسلک ہے۔ جسکا ادعا یہ ہے کہ حسن و محبت کی داستان خود اپنے اندر ایسی پر کشش جاذبیت اور اثر رکھتی ہے۔ کہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو سمیٹنے کی ضرورت نہیں۔

بشیر امجد غزل کی مروجہ سیدھی سادی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے تصور میں غزل ایک ایسی صنف ہے جس میں فلسفہ و فکر کی گنجائش ضرور ہے۔ لیکن یہ غزل کا لازمی عنصر نہیں۔ غزل ایک جذباتی صنف ہے وہ دماغی ورزش نہیں۔ ساز دل کی آواز ہے ذوق و شوق کی رہین منت ہے۔ بشیر امجد کی غزلیں انہیں اوصاف کی آئینہ دار ہیں۔ انکی غزلوں کا مطالعہ یہ خوش گوار انکشاف کرتا ہیکہ غزل کا خمیر، نفاست، لطافت اور شیرینی و موسیقیت سے تیار ہوا ہے۔ اور یہ عناصر اسی وقت ابھرتے ہیں جب غزل کے مجموعی تاثر کو غزلیت یا تغزل سے آشنا کیا جائے جسے غزل کی زبان میں "حدیثِ دلبری" کا نام دیا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ بشیر امجد کی غزلیں ان کی خوش گوئی اور شیریں کلامی کے دل پذیر نمونے ہیں جو انکے فطری غزل گو ہونے کا ثبوت ہے

غزل کہنا تو آسان ہے لیکن غزل کو اس کے مزاج کے ساتھ پیش کرنا بہت مشکل ہے۔ غزل ایک خاص مزاج کا شاعر سے مطالبہ کرتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ جناب امجد کا مزاج اس مطالبہ سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہے۔ جس کی تکمیل وہ بڑی سادگی و صفائی سے کرتے ہیں۔ انکی غزلیں ایسی ہی ہیں جیسی سب کی ہوتی ہیں۔ وہی واردات، وہی معاملات

وہی احساس و کیفیات، وہی قصہ ہجر و وصال، وہی شکوہ و شکایت، وہی شوق و انتظار اور وہی لذّتِ دیدار جو دوسروں کے یہاں ہوتی ہے لیکن امجدؔ صاحب کی پیشکش کا انداز انکا اپنا ہے۔ ان کی ہلکی پھلکی غزلیں ایک پُرکیف ماحول میں سانس لیتی ہیں جن میں تبسم لطیف بھی ہے اور نالۂ دلگداز بھی۔ انکا ذوق انہیں ایسی راہ پر لے گیا ہے جس راہ سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ بڑی خوش سلیقگی کیساتھ آگے بڑھے ہیں۔

بشیر امجدؔ کے شعری مجموعہ "رنگِ حیات" کی یہ غزلیں غزل کے بنیادی تقاضے کو پورا کرتی ہیں۔ انکے صاف ستھرے بے تکلف اشعار لطفِ سخن دیتے ہیں۔ جو کچھ کہا ہے سلیقے اور محنت سے کہا ہے۔ مجھے توقع ہے بشیر امجدؔ کا یہ کلام اربابِ ذوق سے خراجِ تحسین حاصل کریگا۔

علی احمد جلیلی، ایم اے (عثمانیہ)
سلطان پورہ - جلیل منزل
(حیدرآباد)

تبصرہ

حامداً ومصلیاً!

کائنات مجاز اور خدا حقیقت ہے۔ مجاز زینہ اور حقیقت منزلِ مقصود ہے۔ انسان کی پیدائش کا مقصد یہی ہیکہ مجاز کے زینہ سے حقیقت کا معائنہ و مشاہدہ کرے۔ اگر اپنی پیدائش کا یہ علم اور مقصد پیشِ نظر نہ رہے تو بہ تقاضائے جہل و غفلت فنونِ لطیفہ کا فنکار مجاز کو حقیقت اور زینہ کو منزلِ مقصود سمجھ کر مجاز میں گم ہوجاتا اور اس طرح مقصدِ پیدائش کی تکمیل یعنی معرفت اور مشاہدۂ حق سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس دنیا میں اگر آخر تک بھی غفلت سے نہ جاگے تو یہ محرومی اس کے حق میں ابدی ہوجاتی ہے۔

مجاز کے ذریعہ حقیقت تک پہونچنے والے اردو شعراء میں میرؔ اور اقبالؔ کی مثالیں معروف ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ کلام کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوا کہ شاعرِ محترم کی نظر اسیرِ مجاز رہی ہے لیکن ساتھ ہی یہ محسوس کر کے مسرت بھی ہوئی کہ حقیقت کی تلاش کا جذبِ دروں بھی کارفرما ہے۔ چنانچہ یہ شعر نظر سے گذرا۔

جلوہ ان کا نظر نہیں آتا ؛ صرف ان کے نقاب نے مارا

نقاب اور جلوہ کی حقیقت اور دونوں کے ربطِ باہمی کا علم اہلِ دل اور صاحب نظر کی صحبت کے بغیر نہیں ملتا اس لئے "مارنے" کی نسبت نقاب کی طرف کردی گئی ہے۔

ایک جگہ یہ شعر تجسّسِ حقیقت کا ترجمان ہے۔

کون کہتا ہیکہ منزل نہیں ملتی امجدؔ ؛ عزم کے ساتھ جلو گے تو خدا ملتا ہے۔

احقر کی دعا ہیکہ شاعرِ محترم کو عزم کیساتھ جانبِ منزل چلنا نصیب ہو۔

ایک اور جگہ خود شناسی کی طلب اور خدا شناسی کی تمنّا صاف جھلکتی ہے۔

آپ کو ڈھونڈ لوں گا کہیں ؛ پہلے میرا پتہ دیجئے۔

احقر کا حسنِ ظن ہے کہ شاعرِ محترم کی طلبِ صادق پر انہیں اپنا پتہ بھی مل گیا ہوگا اور پتہ دینے والے کو انہوں نے ڈھونڈ بھی لیا ہوگا۔ اگر بالفرض ایسا نہیں ہوا تو بصد خلوص وادب احقر کی گذارش ہیکہ خود اپنے قال کو حال بنانے کی سعی میں لمحات کی تاخیر بھی نہ فرمائیں اقبال علیہ الرحمہ واضح اشارہ کرتے ہوئے گذر گئے۔

یہ عالم یہ بتخانہ چشم و گوش ؛ جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی ہے یہ منزلِ اولیں ؛ مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر ؛ طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

اور خود اپنے فنِ شعر کا اس طرح تعارف کرایا:

مرے اشعار میں پھنس کر نہ رہ جا ؛ رہِ قرآں میں گامِ اوّلیں ہے

قال کو حال بنانے کی خاطر عارف رومی علیہ الرحمہ کا مشورہ ملاحظہ ہو:

قال را بگذار و صاحبِ حال شو ؛ پیشِ مردِ کاملے پامال شو

فقط والسلام

احقر العباد
محمد عبدالقیوم جاوید عفی عنہٗ
(محبوب نگر)

اک تعارف

نام محمد بشیر الدین احمد۔ قلمی نام بشیر امجد۔ وطن ضلع محبوب نگر

بشیر امجد صاحب ایک ہمہ گیر شخصیت کے انسان ہیں۔ اس لئے فکر یہ لاحق ہے کہ ان کی زندگی کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کرنے میں میرا قلم کس درجہ کامیاب رہے گا۔ موصوف ۲۸ سال کے عرصہ تک بحیثیت مہتمم مارکٹ خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۷۵ء میں وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے ہیں۔

قبل اس کے کہ موصوف کی ادبی و شعری خدمات کا رُخ کروں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ انکا کلام جس قدر رنگین ہے ٹھیک یہی حال ان کی ظاہری وجاہت کا بھی ہے۔ رنگ گورا، قد پورے چھ فٹ کا، ناک نقشہ نہایت بانکا۔ ایک راز کی بات یہ ہے کہ وہ بظاہر کوئی ۵۵ سال کے لگتے ہیں حالانکہ موصوف کی موجودہ عمر پورے ۷۰ سال کی ہے۔ خدا کرے کہ جناب کی صحت ہمیشہ ایسی ہی قائم رہے۔

آیئے اب بشیر امجد صاحب کی ادبی و شعری خدمات کا جائزہ لیں۔ موصوف جو میرے والد شیخ محبوب نگری (کہنہ مشق شاعر) کے ہمعصر ہیں۔ اپنے دورِ شباب میں بڑے دلنشین ترنم میں اپنا کلام سنایا کرتے۔ اور میں زمانۂ طالب علمی میں انکا کلام بڑے اشتیاق سے سنا کرتا۔ اسی دوران شاعری کے جراثیم مجھ میں بھی داخل ہونے لگے۔

سامعین اکثر موصوف سے رومانی کلام کی خواہش کرتے اور وہ سلسلہ آج تک بھی جاری ہے کچھ عرصہ قبل موصوف حیدرآباد منتقل ہو چکے ہیں۔ اس لئے [illegible]

کے مشاعروں میں موصوف کی شرکت کی خبریں پڑھنے کو ملتی رہتی ہیں۔ ہم نے بہت سے مشاعرے اکٹھے بھی پڑھے ہیں۔ بات جب رنگین اور رومانی کلام کی چھڑ ہی گئی ہے تو اسی مزاج کے چند اشعار ہدیۂ خدمت کرتا ہوں۔

درد دل کی دوا دیجئے ؛ ورنہ سولی چڑھا دیجئے
زلفوں کے سنورنے میں کچھ دیر تو لگتی ہے ؛ ہر حال میں یہ محفل تم کو ہی سجانی ہے۔
بیمار محبت ہوں عنایت کی نظر ہو ؛ دامن کی ذرا آپ ہوا کیوں نہیں دیتے
تیرے گیسوؤں کا ملا جب سے سایہ ؛ مقدر پہ اپنے یہ مغرور دل ہے

موصوف نہ رند ہیں نہ ساقی البتہ اپنے اشعار میں میکشی کا ذکر خوب فرماتے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

میکشی رک نہ جائے کہیں ؛ بادلوں کو دعا دیجئے
ساقیا تو ہی بتا کیا ہو مقدر اپنا ؛ تشنگی اوج پہ ہے اور گھٹا چھائی ہے
سامنے جام جو آجاتا ہے ؛ پھر بھلا کس سے رہا جاتا ہے
ساقی کا ہے کرم کہ نوازش ہے رند کی ؛ امجد کا جام ہاتھ سے گر کر سنبھل گیا

بشیر امجد صاحب کے کلام کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ انکے ہاں مایوسی، نا امیدی بے کلی، بیقراری، رنج و غم، درد و الم، آہ و فغاں کے عناصر بھی جا بجا ملتے ہیں۔ پتہ نہیں موصوف کے دل میں کیا کسک رہی ہے جو شعر کے پیکر سے یوں نمودار ہوتی ہے

اک تصور ہے جو ہر وقت لگا رہتا ہے ؛ شہر میں رہ کے بھی تنہائی سی تنہائی ہے
سوزشِ غم کو بڑھانے لگیں یادیں تیری ؛ تیری یادوں کو کلیجے سے لگالایا ہوں
ظلم کی کوئی حد تو ہو آخر ؛ بار غم اب سہا نہیں جاتا
محبت نے ہمکو کہاں لا کے چھوڑا ؛ نہ انکا پتہ ہے نہ اپنا پتہ ہے

لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ ذاتِ مطلق سے کبھی دور رہے ہیں۔ ہمیشہ خالقِ کائنات پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور وجہ وجود کائناتؐ کی حیاتِ طیبہ کو اپنے لئے بہترین نمونۂ عمل خیال کرتے ہیں۔ تمثیلاً چند اشعار پیش ہیں

یہ مجبور انسان پکارے تجھی کو ❖ کہ قبضہ میں تیرے زمین آسماں ہے
تو بخشش کا سامان کردے خدارا ❖ ترا نام امجدؔ کے وردِ زباں ہے
زمین سے فلک تک ہے تیرا ہی جلوہ ❖ ہمارے دلوں کو بھی روشن بنادے
ہو نیچی نظر اور گردن خمیدہ ❖ ادب کی جگہ ہے دیارِ مدینہ

آخر میں اس حقیقت کو واضح کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ کسی شاعر کا کلام اس کی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت اور کردار کا عکاس ہوتا ہے یعنی ہم بشیر امجدؔ صاحب کی شاعری سے انکی تصویر اتار سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہیکہ انکے اشعار قدیم روش کے ہوتے ہوئے بھی حسنِ لفظی و حسنِ معنوی کے حامل ہیں۔ انکا پڑھنے والا اپنی جنت گوش ضرور آباد کرسکتا ہے۔

میرے خیال میں موصوف کا یہ پہلا مجموعہ یقیناً پسند کیا جائیگا۔ جو دیر سے سہی مگر منظرِ عام پر آتو رہا ہے۔ امید کہ قارئین ضرور حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

سلیم عابدیؔ
(ایم اے۔ عثمانیہ)
شیخ منزل۔ مدینہ مسجد
محبوب نگر (اے پی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد

تصوّر سے اُونچا ترا آستاں ہے
تخیّل بھی جا کر لرزتا جہاں ہے

کہو وحدہٗ لاشریک لہٗ تم
ہر اک کی زباں پر یہ میٹھا بیاں ہے

تباہی کی منزل سے دوچار ہیں ہم
کرم تیرا یارب نہ جانے کہاں ہے

نظر میں ہے قوّت تو آساں ہے جلوہ
کبھی تو یہاں ہے کبھی تو وہاں ہے

یہ مجبور انساں پکارے تجھی کو
کہ قبضہ میں تیرے زمین آسماں ہے

علاج اس کا ممکن نہیں ہے کسی سے
مرے دل میں اب تک جو درد نہاں ہے

تو بخشش کا سامان کر دے خدا را
ترا نام امجد کے وردِ زباں ہے

حمد

بنا دے خدایا تو اپنا بنا دے
بھٹکتے ہوؤں کو تو رستا بتا دے

تو بے شک اکیلا مجیب الدعا ہے
تجھے میں پکاروں تو مجھ کو صدا دے

تو ہے حکمراں اپنی اس مملکت کا
ترے ہم ہیں بندے، سزا دے جزا دے

زمیں سے فلک تک ہے تیرا ہی جلوہ
ہمارے دلوں کو بھی روشن بنا دے

تجھے دیکھنے کی تمنّا ہے دل میں
کسی روز تو اپنا جلوہ دکھا دے

مَن و تو کا جھگڑا رہیگا یہ کب تک
جو ہے درمیاں اب وہ پردہ اٹھا دے

تیرے نام لیوا ہیں تجھ سے ہے نسبت
بلائیں ہمارے سروں سے ٹلا دے

زمین آسمان جس طرح سے سجایا
مرا دل بھی اپنے کرم سے سجا دے
مری کشتی طوفان میں گھر گئی ہے
اسے پار اپنے کرم سے لگا دے
ہر اک شئے میں پنہاں جو ہے نور تیرا
اُسی نور سے دل کی دنیا بسا دے
سب اہلِ زمین آج بھٹکے ہوئے ہیں
تو مخلوق کو راہ اپنی لگا دے
نہ امجدؔ کو حاجت رہے میکشی کی
مئے نورِ رحمت اسے بھی پلا دے

نعت شریف

طوافِ حرم ہم کیئے جا رہے ہیں
بہ ہر گام رحمت لئے جا رہے ہیں
نہیں درمیاں کوئی اپنے ہمارے
خدا سے تکلّم کیئے جا رہے ہیں
سبھی مست و مدہوشِ جوشِ جنوں ہیں
مئے رازِ اُلفت پیئے جا رہے ہیں
قدم دھیرے دھیرے اٹھاتے ہیں ہر دم
بس اک دھن میں چکّر کیئے جا رہے ہیں
مقامِ براہیم پر سب کی نظریں ہیں
حجرِ اسود کا بوسہ لیئے جا رہے ہیں
زباں پر ہے لبّیک لبّیک لبّیک
نگاہوں سے سجدے کیئے جا رہے ہیں
جنونِ محبت میں امجد کا عالم
کہ نامِ خدا ہی لیئے جا رہے ہیں

نعت شریف

نبیؐ کا ہے مسکن دیارِ مدینہ
چلو چل کے دیکھیں بہارِ مدینہ
نکل جائے دم یا رہے سانس باقی
دل و جان کریں گے نثارِ مدینہ
ہو نیچی نظر اور گردن خمیدہ
ادب کی جگہ ہے دیارِ مدینہ
مقدّر مرا خود بخود جاگ اُٹھے
جو مل جائے مجھ کو غبارِ مدینہ
نہیں مجھ کو حسرت کسی اور شئے کی
مجھے چاہئے بس دیارِ مدینہ
قدم سوئے طیبہ کھنچے جا رہے ہیں
نظر میں بسا ہے خمارِ مدینہ
تڑپ آج امجدؔ کی پوری ہوئی ہے
کہ لوٹی ہے اس نے بہارِ مدینہ

نعت شریف

مدینہ کے داتا کا دیدار ہے آج
مسرت میں دل میرا سرشار ہے آج
صبا دیکھنا راہ میں تو نہ آنا
مقدّر غریبوں کا بیدار ہے آج
میرا ماجرا میرے سرکار سُن لو
گنہگار مائل بہ گفتار ہے آج
جو موقع ملا ہے نہ غفلت میں کھونا
کرم سے بھری ان کی سرکار ہے آج
خشوع و خضوع التجا میں ہے جس کی
وہی مغفرت کا سزاوار ہے آج
چلے آرہے ہیں ہزاروں فدائی
محبت میں ہر اک گرفتار ہے آج
جو چاہے وہ مانگے چلے جاؤ امجد
کہ رحمت سے بھرپور دربار ہے آج

نعت شریف

ہر زخم منوّر ہے میرا عشقِ نبیؐ سے
اُلفت ہے مجھے خاص رسولِؐ عربی سے

جس کو ہو محبت شہِؐ مکی مدنی سے
وابستہ وہ رہتا ہے درِ پاک نبیؐ سے

بھٹکے ہوئے انسان یہ کیا سوچ رہا ہے
اُٹھ اور گذر جا ذرا طیبہ کی گلی سے

عقبیٰ بھی اسی کی ہے یہ دُنیا بھی اسی کی
جس دل کا رہے رشتہ دو عالم کے غنی سے

ہر گام ہدایت جنھیں اللہ سے ملی ہے
سچائی کا رستہ ملا انسان کو اُنہی سے

امجد کو بلا لیجئے یہ ہر حال مدینہ
نالاں ہے یہ اس زندگی و خستہ دلی سے

نعت شہ پیغمبر

قافلہ اسلام کا ہے جس کے رہبر آپ ہیں
اول و آخر ہیں جو حق کے پیمبر آپ ہیں

کون کیا سمجھیگا اسکو دل سے دل کی بات ہے
لاکھ ہوں اوروں کے دلبر میرے دلبر آپ ہیں

گو پیمبر کتنے ہی آتے رہے جاتے رہے
سب میں بہتر آپ ہیں اور سب سے برتر آپ ہیں

نیک راہوں کے لئے ملتا رہا پیغام حق
کفر کو جس نے مٹایا وہ پیمبر آپ ہیں

آپ کی اُمت کو آقا، ہے سہارا آپ کا
سچ تو یہ ہے اپنی اُمت کا مقدر آپ ہیں

آپ کا ادنیٰ یہ امجد کیوں اندھیروں سے ڈرے
روشنی کے واسطے نورانی پیکر آپ ہیں

نعت شریف

تصوّر کی جنّت خیال آپ کا ہے
جو دل میں بسا ہے جمال آپ کا ہے

پشیماں پشیماں پریشاں پریشاں
کہ ہر آن دل میں ملال آپ کا ہے

بلالیں مدینہ دکھادیں نظارہ
بتادیں جہاں کو کمال آپ کا ہے

سراپا محبت، مجسّم مروت
کسی نے نہ سمجھا جمال آپ کا ہے

خدا کی حقیقت بشکلِ محمّدؐ
جواب آپ کا ہے سوال آپ کا ہے

مجھے بھی تو خاکِ کفِ پا عطا ہو
فدائی بہ شکلِ بلالؓ آپ کا ہے

یوں فرقت میں امجد گزاریگا کب تک
بھٹکتا ہے اس کو خیال آپ کا ہے

غزلیات

زندگی بس حادثوں اور لغزشوں کا نام ہے
موت ہی سے کھیلتے رہنا ہمارا کام ہے

صبح نو لے کر چلی آئی حسیں پیغام ہے
سنتے ہیں ان کی زباں پر اب ہمارا نام ہے

حال کے ماتھے پہ بس چھائی ہوئی ہیں تلخیاں
عہدِ ماضی تھا درخشاں اب وہی گمنام ہے

میکدے کی سرزمیں، جنت سے ہم کو کم نہیں
یہ جگہ وہ ہے جہاں آرام ہی آرام ہے

درد و غم، بے چینیاں، رنج و الم، آہ و فغاں
کس کشاکش میں ہماری، آج صبح و شام ہے

آزما کے دیکھ لیں گے میکدہ میں ایکبار
چشم ساقی کا سنا ہے آج فیضِ عام ہے

زندگی بھی جانے کیسے موڑ پر آکر رکی
رنج و غم کی صبح ہے اور بیکسی کی شام ہے

سعیٔ لاحاصل ہے اس کو ڈھونڈنے سے فائدہ
زلف کے سائے میں امجدؔ آج زیرِ دام ہے

○

جو دل پہ گذرتی ہے بتا کیوں نہیں دیتے
روداد غم عشق، سنا کیوں نہیں دیتے

اے بادِ صبا ان کو تو جاکر یہ بتا دے
بگڑی مری آکر وہ بنا کیوں نہیں دیتے

بیمار محبت ہوں عنایت کی نظر ہو
دامن کی ذرا آپ ہوا کیوں نہیں دیتے

لازم ہے سدا زیست میں افکار و مصائب
سینے میں لگی آگ بجھا کیوں نہیں دیتے

رکھنا ہے بھرم تم کو اگر اپنے چمن کا
خود اپنے نشیمن کو جلا کیوں نہیں دیتے

مدت سے زمانہ جو ہے نفرت کی ڈگر پر
آداب محبت کے سکھا کیوں نہیں دیتے

یادوں کے جزیرے سے نکل آؤ بھی امجدؔ
جب ان کو بھلانا ہے بھلا کیوں نہیں دیتے

○

وہ غیروں کو ساغر دیئے جا رہے ہیں
یہاں خونِ دل ہم پیئے جا رہے ہیں

برستے ہوئے بادلوں کو نہ دیکھو
ہم ان کی نظر سے پیئے جا رہے ہیں

لبوں پر ہیں ان کے تبسم کی لہریں
محبت کے دھوکے دیئے جا رہے ہیں

ہماری بھی پُرسش کی تکلیف کیجئے
بڑی کشمکش میں جیئے جا رہے ہیں

گناہوں سے توبہ ارے توبہ توبہ
ذرا سوچئے کیا کیئے جا رہے ہیں

مرے سامنے سے گذرتے ہیں لیکن
حیا آنکھ میں وہ لیئے جا رہے ہیں

قدم جانبِ میکدہ جب بھی اُٹھے
اُنہیں یاد ہر دم کیئے جا رہے ہیں

زباں پر مچلتی ہیں کچھ دل کی باتیں
مگر ہونٹ اپنے سیئے جا رہے ہیں

ذرا پارسائی تو امجدؔ کی دیکھو
زمانے کے ڈر سے پیئے جا رہے ہیں

قتل کر دو کہ سرِ دار چڑھاؤ مجھ کو
اپنی نظروں سے خدارا نہ گراؤ مجھ کو

دل ہے پہلے سے ہی برباد محبت اپنا
اور بربادی کا مرکز نہ بناؤ مجھ کو

بزمِ اغیار میں کیوں تم بھی چلے آئے ہو
اب تو اتنا بھی خدارا نہ جلاؤ مجھ کو

آج اپنے بھی پرائے سے نظر آتے ہیں
ہو سکے تو ذرا غیروں سے ملاؤ مجھ کو

خود ہی کھنچ کر مری منزل بھی سمٹ آئیگی
مسکراتے ہوئے اک بار بلاؤ مجھکو

آج راہوں میں پڑا ٹوٹا ہوا ساغر ہوں
چلتے چلتے کہیں ٹھوکر نہ لگاؤ مجھ کو

زلف کی جال میں امجدؔ بھی پھنسا ہے یارو
اسکو اب کیسے بچاؤں یہ بتاؤ مجھ کو

○

حسن خود لا جواب ہوتا ہے
عشق خانہ خراب ہوتا ہے

کیا بھروسہ ہے ان کے وعدوں کا
عہد ان کا سراب ہوتا ہے

بند رکھتے ہیں جو زباں اپنی
ان کا چہرہ کتاب ہوتا ہے

بے سروپا ہزار باتوں کا
بس سکوت اک جواب ہوتا ہے

دامِ الفت میں پھنس گیا جو بھی
اس کا خانہ خراب ہوتا ہے

حد سے بڑھتا ہے جو ستم اکثر
کرم بے حساب ہوتا ہے

تھی اُجالوں کی داستاں امجد
ظلمتوں کا حساب ہوتا ہے

○

غمِ دل سنانے کو جی چاہتا ہے
انھیں آزمانے کو جی چاہتا ہے

شبِ غم جو بے لطف گزری ہے میری
یہ راز اب بتانے کو جی چاہتا ہے

کٹے زندگی بے بہاروں کے کب تک
زمانے پہ چھانے کو جی چاہتا ہے

سنی جب خبر وہ ہیں بیزار ہم سے
کہیں دور جانے کو جی چاہتا ہے

عجب انتہا ہے مرے ضبطِ غم کی
نئے زخم کھانے کو جی چاہتا ہے

خوشی ہوگئی مہرباں مجھ پہ اتنی
اب آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے

نہ کوئی حسرت بھی امجدؔ کی باقی
کہ سب کچھ لٹانے کو جی چاہتا ہے

○

گزاروں میں تنہا گوارا نہیں ہے
ترے پاس آنے کا یارا نہیں ہے

یہ کیا صبح میری، یہ کیا شام میری
نگاہوں میں ان کا نظارا نہیں ہے

نہ ہو جائے بدنام رازِ محبت
ترا نام لے کر پکارا نہیں ہے

جُدائی میں اب ہو گیا ایسا عالم
گزرتے گئے دن، گزارا نہیں ہے

ہمیں خانۂ دل کی کیوں فکر ہوگی
یہ گھر ہے تمہارا ہمارا نہیں ہے

مرا کام ہے ہر اشارے پہ چلنا
حسیں گلبدن کا اشارا نہیں ہے

سہارے تو مجھ کو ملے لاکھ یارو
مگر ہر سہارا سہارا نہیں ہے

پلا پھر سے امجدؔ کو تو جام ساقی
تری بے رخی اب گوارا نہیں ہے

جو پہلو میں تم ہو تو مسرور دل ہے
وگرنہ یہ دل کیا ہے بے نور دل ہے

یہ تیرا کرم ہے یہ تیری عنایت
ہمارا زمانے میں مشہور دل ہے

تیری گیسوؤں کا ملا جب سے سایہ
مقدر پہ اپنے یہ مغرور دل ہے

نہیں ہے مجھے جام و مینا کی حاجت
غمِ عاشقی سے یہ مخمور دل ہے

کھلی بات کو بھی چھپانا پڑا ہے
زباں بند ہے اور مجبور دل ہے

نہیں مجھ سے ممکن بیاں حالِ دل ہو
یہ مسرور دل ہے، کہ رنجور دل ہے

نظر میں ہم ان کی سمائیں گے کیسے
کہ سینہ میں انکے تو مغرور دل ہے

گزرتی ہے جس راہ سے ہر تجلی
وہیں پر ہمارا یہ پرنور دل ہے

زمانہ ہے خوشیوں سے سرشار امجد
میں خوش ہوں کہ غم سے ہی معمور دل ہے

جب بے خودی میں نام تمہارا نکل گیا
محفل میں سب کے چہروں کا نقشہ بدل گیا

اپنے حنائی ہاتھ یہ کس نے اٹھا دیئے
دورِ خزاں کا رنگ اچانک بدل گیا

دو چار گام زیست مری جب کہ رہ گئی
کچھ لغزشوں کا لے کے سہارا سنبھل گیا

آپ آگئے تو ایک غضب ہوگیا یہاں
گلشن میں ہر کلی کا کلیجہ دہل گیا

کیا بات ہے کہ شہرِ وفا میں ہے یہ ستم
میں دیکھتا ہوں جس کو وہ شبنم سے جل گیا

کشتی کے ڈوبنے کا مجھے غم نہیں مگر
ارمان تھا جو موجوں کا وہ تو نکل گیا

وہ دل جو نفرتوں کی فصیلوں میں قید تھا
کیا بات ہے کہ پیار کے سانچے میں ڈھل گیا

وہ حسنِ بے مثال جو محفل میں آگیا
وہ رعب تھا کہ سب کو پسینہ نکل گیا

ساقی کا ہے کرم، کہ نوازش ہے زندگی
امجدؔ کا جام ہاتھ سے گر کر سنبھل گیا

بات کیا ہے کہ آنکھ پُرنم ہے
شمع کی لَو بھی آج مدھم ہے

اشک پینا جو میں نے چھوڑ دیا
جانے کیوں آسماں پہ ماتم ہے

ہم تو پیدا ہوئے ہیں غم کے لئے
یہ بتاؤ کہ تم کو کیا غم ہے

صاف کہتا ہوں صاف کہہ دیجئے
کس لئے دل کی بات مبہم ہے

اس قدر دکھ دیئے ہیں یاروں نے
درد جتنا زیادہ ہے کم ہے

غم اٹھانے کی ہو گئی عادت
دل کا شعلہ بھی آج شبنم ہے

آشیاں جل کے ہو گئی مدّت
آج تک بجلیوں کا ماتم ہے

غم، ستم، آہ، بیکسی امجد
کچھ عجب میرے دل کا عالم ہے

○

دل مرا جس کا تمنائی ہے
لوگ کہتے ہیں وہ ہرجائی ہے

اس برس کیسی بہار آئی ہے
ہر کلی باغ کی مرجھائی ہے

نام لیوا تو ہر اک ہے تیرا
کیوں تو محفل کا تماشائی ہے

ناز ہو کیوں نہ مقدّر پہ مجھے
یار کے دل میں جگہ پائی ہے

حُسنِ یوسف کا زمانہ تو گیا
آج ہر اک تیرا شیدائی ہے

بات غیروں کی کہاں کرتے ہو
بھائی ہو کر بھی کہاں بھائی ہے

جام کو توڑ کے مدّت گزری
پھر نظر کیوں مری للچائی ہے

ہر قدم پھونک کے رکھتا ہوں میں
سانس لیتا ہوں تو رسوائی ہے

آج تک سوچ رہا ہوں امجد
کیوں تمنّاؤں کو موت آئی ہے

ستارے جھلملاتے ہیں خوشی سے جگمگاتے ہیں
محبت کیسی ہوتی ہے زمانے کو سکھاتے ہیں

خدا رکھے سلامت ان کی شوخی کا یہ عالم ہے
وہ جب گلشن میں آتے ہیں ہزاروں گل کھلاتے ہیں

وہ رعبِ حسن طاری ہے نظر کا فیض جاری ہے
یہاں تو پارساؤں کے قدم بھی ڈگمگاتے ہیں

مرا جوشِ جنوں وہ رنگ لایا آج رندوں میں
در و دیوارِ میخانے کے دیکھو تھرتھراتے ہیں

تمہاری یہ ادا، شوخی، شرارت خوب رہتی ہے
بُلانے پر نہیں آتے کبھی چپکے سے آتے ہیں

تمہاری سرد مہری کی شکایت ہم نہیں کرتے
مقدر میں لکھا ہے اس لئے آنسو بہاتے ہیں

بُلانا کچھ ضروری تو نہ تھا امجد کو محفل میں
بُلا کر اپنی محفل میں خدارا کیوں اٹھاتے ہیں

دیا ہے درد تو دل کی مرے دوا تو کرو
مریضِ عشق تمہارا ہوں کچھ بھلا تو کرو

نہ جانے پھر یہ مری زندگی ملے نہ ملے
اٹھاؤ ہاتھ خدارا ذرا دعا تو کرو

تعلقات میں آجائے زندگی پھر سے
دلوں کو دردِ محبت سے آشنا تو کرو

ہر اک بات تمہاری سر آنکھوں پر لیکن
ہماری بات بھی آخر کبھی سنا تو کرو

مصیبتوں سے ڈراؤ تو ہم نہیں ڈرتے
زمانے والو مصیبت کو تم سوا تو کرو

حیات کیسی جہاں لذّتِ حیات نہیں
ہر ایک گام پہ مشکل کا سامنا تو کرو

حقیقتوں کو چھپانے سے بوجھ بڑھتا ہے
جو دل کا راز ہے ہم سے کبھی کہا تو کرو

یہ جان لو کہ زمانہ خراب ہوتا ہے
قدم قدم پہ سنبھل کے ذرا چلا تو کرو

جناب امجدؔ خستہ نکل پڑو غم سے
خوشی کی گود میں پھولو پھلو مزا تو کرو

ہزاروں کھیل کھیلے زندگی کی رہگذاروں سے
خزاں سے بھی کبھی گذرے کبھی رنگیں بہاروں سے

محبت سے اداؤں سے نگاہوں سے اشاروں سے
نہیں کوئی بشر جو بچ سکے ان ماہ پاروں سے

اگر تیرا کرم ہو جائے تو کیا دیر ہے ساقی
کہ لگ جائے گی کشتی خود بخود آکر کناروں سے

اندھیرے ہوں دھندلکے ہوں کہ وہ پیچیدہ راہیں ہوں
کئی راہوں سے ہم گذرے فقط تیرے سہاروں سے

نہ روٹھو اس قدر اب بھی جاؤ شب نہ ڈھل جائے
سجا رکھی ہے محفل آج ہم نے چاند تاروں سے

خوشی کیسی سکوں کیسا فقط کہنے کی باتیں ہیں
چمن کی داستاں سنتے رہے ہیں لالہ زاروں سے

ہماری آنکھ میں اک بوند آنسو کی نہیں باقی
ملے فرصت تو لے آئیں گے آنسو غمگساروں سے

یہ کیسا گلستاں ہے ہر طرف پتھراؤ ہے یارو
یہاں کی ہر روش کچھ کم نہیں ہے ریگزاروں سے

یہ انسانوں کا جنگل ہے یہاں کا ہے عجب عالم
یہاں کی فصل ہے بے فیض کیا ہو غم کے ماروں سے

گل و شبنم سے اس کو دور ہی رکھو تو اچھا ہے
بڑی مدت ہوئی امجد کو نسبت ہے شراروں سے

غم زدہ ہوں مرے حصّے میں سحر ہے کہ نہیں
نخلِ نومیدی کی شاخوں میں ثمر ہے کہ نہیں

ان جفاؤں کا گلا کچھ بھی نہیں ہے لیکن
کیا دُعاؤں میں مری کوئی اثر ہے کہ نہیں

زندگی راز سہی، راز ہی رہنے دو اسے
یہ نہ پوچھو کہ مجھے کل کی خبر ہے کہ نہیں

عمر ساری تو کٹی غیر کی ہمدوشی میں
دو گھڑی کیلئے ہم پہ بھی نظر ہے کہ نہیں

حسرتِ دید میں پتھرا گئیں آنکھیں میری
یہ تو بتلاؤ کہ تم کو بھی خبر ہے کہ نہیں

دشت پیما ہوں نہ پوچھو یہ کبھی تم مجھ سے
کوئی گلشن بھی سرِ راہ گذر ہے کہ نہیں

دِل سی شئے آپ کے ہم نے جو حوالے کی تھی
اب کہاں ہے وہ کچھ اس کی بھی خبر ہے کہ نہیں

ایک میلہ ہے درِ یار پہ لیکن امجد
کون جانے وہاں اپنا بھی گذر ہے کہ نہیں

اک وقت کسی پر کبھی ایسا بھی پڑا ہے
لاش اپنی اٹھائے کوئی خاموش چلا ہے
ہر اک ترے کوچے میں ہی برباد ہوا ہے
کیا نام اسے دیں یہ جگہ سب سے جدا ہے
الفت ہے کہ رغبت ہے یہ کیا ہم کو پتہ ہے
کشتی کو تو طوفان نے خود گھیر لیا ہے
آؤ کہ کریں کچھ تو زمانے کے لئے ھم
یہ وقت بھلا کس کے رکانے سے رکا ہے
کچھ اتنے مصائب سے میں دوچار ہوا ہوں
حالات نے اب خون مرا چوس لیا ہے
کیوں سامنے غیروں کے میں ہاتھ اپنا بڑھاؤں
بندہ ہوں ترا اس لئے تجھ ہی سے گلہ ہے
غیروں کے لئے آج تڑپتا ہے مسیحا
اپنے ہی لئے کوئی دعا ہے نہ دوا ہے
غیروں نے تو بڑھ بڑھ کے دیا ہمکو سہارا
سمجھے تھے جسے اپنا وہ خاموش کھڑا ہے
اب تم ہی بتاؤ کہ کدھر جائیں گے آخر
منزل کا پتہ ہے نہ تو رہبر کا پتہ ہے
میں حد سے سوا لینے کا قائل بھی نہیں ہوں
یارب تو وہی دے مجھے جو تیری رضا ہے
گھبرا کے دعا موت کی مانگی تو تھی امجد
لیکن میری تقدیر میں جینے کی سزا ہے

ماضی کے دھندلکوں سے جب یاد تری آئی
بے ساختہ پھر میری پلکوں پہ نمی آئی

اے روٹھنے والے تو کچھ صبر تو کر لیتا
آدابِ محبت میں کیا کوئی کمی آئی

یہ اپنی محبت کا شائد کوئی پہلو ہو
ہم دار پہ چڑھتے ہی یاروں کو ہنسی آئی

کیا بات ہے مقتل میں تلوار نہیں چلتی
قاتل کی نگاہوں میں کیا کوئی کمی آئی

ایسا نظر آتا ہے پیغام بہاروں کا
پھر بادِ صبا گھر تک مشکل سے چلی آئی

شائد مرے مرنے سے احساس ہوا سب کو
احباب تھے افسردہ جب یاد مری آئی

میخانے میں ہلچل ہے ساغر بھی ہیں شیشے بھی
حصّہ میں مرے امجدؔ کیوں تشنہ لبی آئی

○

دیدار کی حسرت میں بے نور ہوئیں آنکھیں
آیا جو خیال ان کا رنجور ہوئیں آنکھیں

میخانے کو جانے کی حاجت ہی نہیں ہم کو
آنکھوں نے پلائی ہے مخمور ہوئیں آنکھیں

شعلے جو اُٹھے دل سے پلکوں پہ رُکے آکر
جب آپ قریب آئے کیوں دور ہوئیں آنکھیں

غمگین و پریشاں تھے فرقت میں فقط ان کی
دیکھا جو جمال انکا پُرنور ہوئیں آنکھیں

یادوں کے دریچے میں کیا کیا نہ ملا مجھکو
چھائے رہیں مرے دل پر مسرور ہوئیں آنکھیں

اک یاد مسلسل نے بے چین کیا امجد
اشکوں کے سمندر میں مستور ہوئیں آنکھیں

O

آہ و فغاں میں زیست تو اپنی پھنسی رہی
حصے میں اپنے کوئی نہ اب تک خوشی رہی

وہ راز آج تک بھی عیاں ہم نہ کر سکے
سینے میں اپنے سانس گھٹی کی گھٹی رہی

اک وہ کہ بے پیئے بھی ہیں سرشار اب یہاں
اک ہم کہ پی گئے بھی تو تشنہ لبی رہی

بہرحال اپنی پیاس بجھاتے رہے مگر
اک غم کی پیاس تھی جو لگی کی لگی رہی

ویسے بھی تیرا فیض و کرم کم نہ تھا مگر
وہ آس کیا تھی جو مرے دل سے لگی رہی

احباب رشتہ دار سبھی آئے دیکھنے
لیکن ہر ایک لمحہ تمہاری کمی رہی

آنکھوں کے سامنے تھے نظارے بہت مگر
پیاسی نظر تو آپ کی جانب لگی رہی

امجد وہ بزم جس کو سجایا سلیم نے
محبوب کے نگر میں سجی کی سجی رہی

○

ہوک اُٹھتی ہے تو سینے میں دبائی جائے
راز کی بات بہ ہر حال چھپائی جائے

شب تاریک ہے آؤ تو قباحت کیا ہے
تشنہ لب ہوں میں ذرا پیاس بجھائی جائے

تیری چاہت میں تڑپتے رہیں قیدی کب تک
درِ زنداں کی یہ زنجیر ہلائی جائے

ساقیا حرف نہ آئے کہیں میخانے پر
تشنگی میری بہر حال بجھائی جائے

زاہدِ خشک کو اپنا تو بنانا ہوگا
میکدے کی بھی اُنہیں راہ دکھائی جائے

کب سے بے چین ہیں، مضطر ہیں بہت پیاسے ہیں
عید کا جشن ہے بھر بھر کے پلائی جائے

دور رہنے کی ہمیں ان سے شکایت تو نہیں
اپنی تصویر کم از کم تو دکھائی جائے

ذرہ ذرہ سے عیاں ہے یہاں خونِ ناحق
بستی ویران سہی پھر بھی بسائی جائے

امتحاں لینا ہے امجدؔ کا تو لے لیں آکر
آپ فرمائیے کیا جان لٹائی جائے

شب تاریک سے کیا ہم کو بھلا ملتا ہے
دِل جو دُکھتا ہے تو زخموں کا صِلہ ملتا ہے

راہ پر ہو کے جو تو ہو گیا گُمراہ کبھی
رشتہ ہر حال میں بس تجھ سے ہی جا ملتا ہے

کس لئے ڈھونڈتے ہو اس کو دیوانوں کی طرح
ذرّے ذرّے سے یہاں اُس کا پتا ملتا ہے

حُسن والوں کو جفاؤں پہ مزہ آتا ہے
عشق والوں کو تو کچھ اور صِلہ ملتا ہے

درد کو دِل میں سلیقے سے چھپائے رکھئے
جانے اس درد کا کس وقت صِلہ ملتا ہے

بات تو جب ہے کہ آکر وہ مرے پاس ملے
یوں وہ ملنے کو سرِ راہ سدا ملتا ہے

میرے مالک تو عنایات کی بارش دیدے
کوئی پھیلائے ہوئے دست دعا ملتا ہے

کون کہتا ہے کہ منزل نہیں ملتی امجد
عزم کے ساتھ چلو گے تو خُدا ملتا ہے

O

جب سے تمہاری چاہ کا امکاں نہیں رہا
اب دل میں پیار کا کوئی ارماں نہیں رہا

دانستہ ہم نے غم کو گلے سے لگا لیا
اب کوئی اپنے درد کا درماں نہیں رہا

دل اُن کا، جان اُن کی، غرض سب اُنہی کا ہے
اب کوئی راز اُن سے تو پنہاں نہیں رہا

انسانیت کے نام سے انساں ہے بے خبر
انسان جس کو کہتے ہیں انساں نہیں رہا

دانستہ بڑھ کے ہم ہی بیاباں میں آ گئے
کیا کیجئے کہ لطفِ گلستاں نہیں رہا

دنیائے غم نے دل کو سہارا سا دے دیا
میں زندگی سے آج پریشاں نہیں رہا

امجد خود اپنی آگ میں ہم جل کے رہ گئے
اچھا ہوا کہ غیر کا احساں نہیں رہا

O

لُٹتی ہوئی چمن کی بہاروں کو کیا کروں
پُر درد غم نواز، نظاروں کو کیا کروں

میری تباہی جس کی خوشی کا سبب بنے
ایسے فریب ناک سہاروں کو کیا کروں

دن رات غم اسیری کا اور یادِ آشیاں
ایسے میں جگمگاتی بہاروں کو کیا کروں

پانی سے آگ بجھنے کا امکان ہے مگر
سینے کے ان بھڑکتے شراروں کو کیا کروں

نا اہل رہبروں کی قیادت میں جو لُٹیں
ان قافلوں کی راہ گذاروں کو کیا کروں

طوفان کی نذر ہو گئی، اُمید جس سے تھی
کشتی ہی جب نہ ہو تو کناروں کو کیا کروں

کیا جانے کب ہو موت، کہاں اور کس جگہ
موہوم زندگی کے اشاروں کو کیا کروں

امجد جب اپنا عزم ہو محکم، قوی ہو دِل
ناسازگار دل کے سہاروں کو کیا کروں

O

اُس کا خیال ہیں ہوں وہ میرا خیال ہے
اُس پر نظر اٹھائے کوئی کیا مجال ہے

کچھ رُعب تیرے حُسن کا، طاری ہے اس قدر
آنکھیں ملائے تجھ سے، یہ کس کی مجال ہے

اک نور سا فضا میں برستا ہے اب یہاں
یہ روشنی ہے یا کوئی تیرا جمال ہے

آفت ہر ایک گام پہ ملتی رہی ہمیں
اتنے بڑے جہاں میں تو جینا محال ہے

کیا ہو گیا ہے آپ کو اتنا بتائیے
چہرہ ہے پُر ملال تو حالت نڈھال ہے

ذرے کو آفتاب بنا تا رہا ہے تو
تیرے لئے تو کچھ نہیں، ادنیٰ کمال ہے

امجد یہ میکدے میں جھجکنا نہیں ہے ٹھیک
لے لو، اُٹھا لو جام، یہ اپنا ہی مال ہے

سانس لے کچھ دیر تک یہ سایۂ دیوار ہے
چلنے والے چل سنبھل کر، راستہ پرُخار ہے

ہوش میں آ ہو سکے تو کچھ خرد سے کام لے
دوست تو سمجھا ہے جس کو وہ بڑا عیّار ہے

موت بھی آئی ادھر، اور آپ بھی آئے یہاں
زندگی کس مرحلے میں، موت سے دوچار ہے

داستاں اُس کو سُنا کر، ہوں پشیماں دوستو
آنکھ سے آنسو رواں ہیں اور دل بیمار ہے

کشمکش میں آ گئی ہے زیست کی کشتی مری
میں نہیں اس کو عزیز اور مجھ کو اس سے پیار ہے

دل جگر، خوشیاں، سکوں ہر چیز تو ہے آپ کی
شوق سے لے لو اگر یہ زندگی درکار ہے

آپ کی چاہت سے ہی مجھ کو ملا صبر و قرار
آپ کی چاہت نہ ہو تو زندگی دشوار ہے

وہ جدھر جاتا ہے امجد میں ہوں اس کے ساتھ ساتھ
سا تھ میرے آنے کو سارا جہاں تیار ہے

○

پھر تری بزم میں اک بار میں آکر دیکھوں
بار غم اور اُٹھانا ہے اُٹھا کر دیکھوں

مثلِ سُرمہ ترے نینوں میں سما کر دیکھوں
جذب پھر ہو کے خوشی سے میں لجا کر دیکھوں

بستر گُل پہ، لحافوں میں جو رہتے ہیں سدا
وقت آیا ہے زمیں پر انہیں لا کر دیکھوں

مرے ہمدم تجھے ہر حال میں پانے کے لئے
دِل میں ٹھانی ہے کہ ہستی کو مٹا کر دیکھوں

دردِ غم، رنج والم، چاک جگر، دیدۂ نم
یہ جو باقی ہیں سبھی تجھ پہ لُٹا کر دیکھوں

عقل کہتی ہے چھپانا ہی تجھے بہتر ہے
دِل یہ کہتا ہے تجھے سامنے لا کر دیکھوں

روشنی آپ کو مطلوب ہے دید و نگا فروز
لیجئے اپنے نشیمن کو جلا کر دیکھوں

جس نے چھینا ہے بڑے جبر سے دل کو میرے
سوچتا ہوں اُسے سُولی پہ چڑھا کر دیکھوں

میکدہ سامنے ہے کیسے بچوں گا انجیلہ
ہاتھ بڑھتا ہے ذرا جام اٹھا کر دیکھوں

○

ہزاروں آفتوں سے بھی نکلنا جانتے ہیں ہم
زمانے کی روش کو بھی بدلنا جانتے ہیں ہم

نہیں ممکن کہ اندازہ نہ ہو کچھ اپنی طاقت کا
کسی صورت سے دشمن کو کچلنا جانتے ہیں ہم

گرانا اتنا آساں ہے تو ہم کو آزما لو تم
"گرانا تم کو آتا ہے سنبھلنا جانتے ہیں ہم"

ہیں سیدھے سادھے مت کھینچو ہمیں دشوار راہوں پر
کبھی ٹیڑھی سی راہوں پر بھی چلنا جانتے ہیں ہم

جلانے والو آخر کس قدر ہم کو جلاؤ گے
کہ دل کی آگ میں ہنس ہنس کے جلنا جانتے ہیں ہم

ہمارے ظرف کا اے باغباں کیا علم ہے تجھکو
چمن کی ہر سیاست کو مسلنا جانتے ہیں ہم

غموں کے قافلے امجدؔ ہمارا کیا بگاڑیں گے
غموں کے ساتھ ہی چل کر بہلنا جانتے ہیں ہم

شوقِ دیدار کو پلکوں پہ بٹھا لایا ہوں
تیری تصویر کو نظروں میں چھپا لایا ہوں

پھول کو ہاتھ لگایا نہ کلی کو چوما
پیار کانٹوں سے تھا کانٹے ہی اٹھا لایا ہوں

گر ہوا اقرارِ وفا تو یہ مری قسمت ہے
دل کی اُمید کو آہوں میں دبا لایا ہوں

سوزشِ غم کو بڑھانے لگیں یادیں تیری
تیری یادوں کو کلیجے سے لگا لایا ہوں

میری آہیں، مرے آنسو، میری ویراں یادیں
دل کی کشتی میں یہ سوغات سجا لایا ہوں

امتحاں ان کی محبّت کا مجھے لینا ہے
دل کے داغوں کا ایک آئینہ بنا لایا ہوں

تیری آمد پہ سجانے کے لئے گھر اپنا
کتنے پُر نور ستاروں کو اُٹھا لایا ہوں

چاک داماں کا اب کس سے گلہ ہو امجد
دوش پر اپنی ہی تقدیر اٹھا لایا ہوں

دُزدیدہ نگاہوں میں شرر دیکھ رہا ہوں
بدلے ہوئے تیور کا اثر دیکھ رہا ہوں

مسرور ہوں، شاداں ہوں، مقدر پہ ہوں نازاں
میں اپنی زمیں پر بھی قمر دیکھ رہا ہوں

خاموش زباں، بند ہیں لب، دل ہے ہراساں
بگڑی ہوئی دُنیا کو مگر دیکھ رہا ہوں

شب جاگتے کٹتی ہے، گنا کرتا ہوں تارے
ہر شب کو میں محرومِ سحر دیکھ رہا ہوں

ہر گام پہ ہنگامہ ہے، ہر گام پہ فتنہ
گرتا ہوں، سنبھلتا ہوں، مگر دیکھ رہا ہوں

تاریکیاں چھائی ہیں، زمانے کی فضا پر
گردوں پہ مگر برق و شرر دیکھ رہا ہوں

امجد کے ہیں حالات اب اس شہر میں ایسے
اپنا ہے، پرایا سا مگر دیکھ رہا ہوں

○

جب سے ملی ہیں نظریں، شعلے بھڑک اٹھے ہیں
اپنے پرائے سب سے اس طرح ہم کٹے ہیں

رہبر سمجھ کے ہم نے رہزن سے دوستی کی
منزل کا ہے تصوّر رستے سے ہی ہٹے ہیں

یہ اتحاد قومی باقی رہے ابد تک
مانا کے آج ہم بھی خانوں میں بٹ گئے ہیں

مشکل پسند ہیں ہم، مشکل سے کیا ڈریں گے
دانستہ آج ہم بھی طوفاں میں گھر گئے ہیں

سارے جہاں سے بچ کر عقل و خرد کو کھو کر
ان کی گلی میں جاکر بے چین ہم کھڑے ہیں

ہم ہیں رہِ وفا میں ثابت قدم ازل سے
جی جی کے مر رہے ہیں مر مر کے جی رہے ہیں

فانی جہاں سے امجد دل کو نہ تم لگاؤ
جتنے تھے ساتھ اپنے ایک ایک سب چھٹے ہیں

○

دِلوں میں ولولے آنکھوں میں حسرت لیے آیا ہے
یہی دن سب کی آزادی کی راحت لے کے آیا ہے

چمن کی ہر کلی نازاں، فضائیں جھوم اٹھی ہیں
پیامِ یومِ آزادی مسرت لے کے آیا ہے

ہمالہ کی طرف نظریں ذرا تم پھیر کر دیکھو
زمیں تا آسماں نصرت ہی نصرت لے کے آیا ہے

نکاتِ بست کی بھی سعیِ پیہم کا اثر دیکھو
مقدر جس سے بدلیگا وہ رحمت لے کے آیا ہے

ہمارا پیار سچا ہے، ہماری چاہ دل سے ہے
ہر اک آپس میں یکجہتی کی لذت لے کے آیا ہے

نہیں کچھ فرق اونچ اور نیچ کا ہر اک برابر ہے
ہر اک چھوٹا بڑا آپس میں چاہت لے کے آیا ہے

یہ مالک کا کرم ہے ساکھ کچھ باقی ہے امجد کی
کہ میدانِ سخن سے کچھ تو شہرت لے کے آیا ہے

مرے حال پر جب سے اُن کی نظر ہے
غمِ زندگی ہے نہ مرنے کا ڈر ہے

اگر ان کو آنا ہو پُرسش کو آئیں
شبِ غم ہماری بڑی مختصر ہے

مرے دل کے ناسور اب بھی ہرے ہیں
دُعائے سحر بھی یہاں بے اثر ہے

شبِ ہجر دیوار بننے نہ پائی
تری چاہ کا آج بھی وہ اثر ہے

کہاں وہ چمن اب، کہاں وہ نشیمن
مگر آج تک بجلیوں کی نظر ہے

نظر میں ہماری فقط تو ہی تو ہے
یہاں ہے وہاں ہے ادھر ہے اُدھر ہے

سمجھ سے ہوں قاصر کہ یہ بات کیسی
کہ جو راہزن ہے وہی راہبر ہے

مقدّر میں اپنے تو بس غم ہی غم ہیں
بتاؤ کہ کیوں آنکھ اُن کی بھی تر ہے

نہ صحرا ہے کوئی نہ گلشن ہے امجدؔ
تری رہگذر بھی عجب رہگذر ہے۔

جرم کے ارتکاب نے مارا
ہم کو ان کے عتاب نے مارا

غیر کی بات چھوڑیئے صاحب
اپنے ہی آفتاب نے مارا

جلوہ ان کا نظر نہیں آتا
صرف ان کے نقاب نے مارا

ساری محفل کے بن گئے مرکز
ان کو ان کے شباب نے مارا

عمر اپنی فریب میں گذری
آرزو کے سراب نے مارا

پارسائی کا جن کو دعوٰی تھا
ان کو آخر شراب نے مارا

بندگی اور ہم سے کیا ہوتی
بس گنہ کے حساب نے مارا

تھے کٹھن اس قدر سوال مرے
مجھکو ان کے جواب نے مارا

زیست مشکل میں کٹ گئی امجد
جانے کس کے عذاب نے مارا

سمجھتے تھے کچھ اور ہوتا گیا کچھ
توقع تھی کچھ اپنی دیکھا گیا کچھ

بڑی قید میں ہم نے رکھا تھا دِل کو
مگر دل ہمارا تو کرتا گیا کچھ

ابھی تک تو مٹنے کی ضرورت نہیں ہے
ہمیں ان کی آنکھوں سے ملتا گیا کچھ

ہماری جُدائی کا منظر عجب تھا
کہ اشکوں کا لاوا اُبلتا گیا کچھ

اثر ہے اُبھرتی جوانی کا شائد
کہ دِل آپ کا پھر مچلتا گیا کچھ

غم عاشقی ہے، نظر سہمی سہمی
جُدائی کا صدمہ بھی بڑھتا گیا کچھ

چلو اپنی برسوں کی اُلفت تو جاگی
خلوص ان کے دل میں بھی آتا گیا کچھ

بڑے پیار سے اس نے امجد کو دیکھا
مزاج اس کا اب تو سنبھلتا گیا کچھ

درد دِل کا کہا نہیں جاتا
ہم سے چُپ بھی ہوا نہیں جاتا

ظلم کی کوئی حد تو ہو آخر
بارِ غم اب سہا نہیں جاتا

دِل سی شئے بھی اگر لُٹا دیجئے
پھر بھی ان کا گلہ نہیں جاتا

قُرب ان کا تو کارِ مُشکل ہے
دور بھی تو رہا نہیں جاتا

ناتوانی کا اب یہ عالم ہے
اِک قدم بھی چلا نہیں جاتا

خیر و شر جو بھی اس سے سرزد ہو
آدمی کا کیا نہیں جاتا

راہ و رسم ان سے حسبِ حال رہے
ورنہ ہم سے جیا نہیں جاتا

سب کو امجد بُھلا چکے لیکن
میکشی کا مزہ نہیں جاتا

درد کا امتحاں نہیں معلوم
زندگی کا نشاں نہیں معلوم

میرے دل میں ہے کیوں مہک اتنی
کون آیا یہاں نہیں معلوم

غم زدہ ہو گئے فرشتے بھی
کس کی تھی یہ فغاں نہیں معلوم

زندگی نے تو راہ دکھلائی
مر کے جائیں کہاں نہیں معلوم

ان کے چہرے پہ پیار ہے لیکن
ہے جو دل میں نہاں نہیں معلوم

اس قدر بجلیوں نے روندا ہے
رونقِ آشیاں نہیں معلوم

ان کے نقشِ قدم خدا کی قسم
آج تک بھی نشاں نہیں معلوم

ہم مزے سے تو سن رہے تھے مگر
کس کی تھی داستاں نہیں معلوم

ساتھ دینے کا کر گئے وعدہ
کیوں ہوئے بدگماں نہیں معلوم

کتنی دشوار ہیں مری راہیں
پر ہے منزل کہاں نہیں معلوم

ہم تو امجد جہاں سے جاتے ہیں
پھر ملیں گے کہاں نہیں معلوم

اس قدر ظلم کی گھڑی کب تک
ہم پہ ان کی یہ برہمی کب تک

ہم نے دیکھے ہیں زندگی کے اُتار
مسکرائے گی یہ کلی کب تک

دیکھیے بات میری سُن لیجیے
سوچیے ایسی بے رُخی کب تک

ان کی نظریں ہر اک سے ملتی ہیں
ان کی آخر یہ سادگی کب تک

زندگی پہ نہ اتنا اتراؤ
زندگی ہے یہ زندگی کب تک

غم ہی دائم ہے غم ہی راحت ہے
ساتھ دے عارضی خوشی کب تک

ہوش میں اب تو آئیے امجد
آپ کا دورِ مے کشی کب تک

عہدِ ماضی شباب میں گذرا
بے خودی میں شراب میں گذرا

اپنی قسمت میں جو لکھا تھا ہوا
لمحہ لمحہ عتاب میں گذرا

سب کی نظریں تھیں ان کی شیدائی
دور ان کا نقاب میں گذرا

جب سے دیکھا ہے اک نظر اس کو
سارا دن پیچ و تاب میں گذرا

جس نے تجھکو بھلا دیا اک بار
وقت اس کا عذاب میں گذرا

کوئی آیا گیا، ہوا کیا کیا
جو بھی گذرا وہ خواب میں گذرا

یاد آتا ہے جس قدر ہم کو
کام اپنا ثواب میں گذرا

عُمر ساری جو کٹ گئی امجد
وقت سارا حساب میں گذرا

زخم کھا کر ہمیں مسکرانا پڑا
دوستی اس طرح بھی نبھانا پڑا

غم ہی مقصود تھا زندگی کے لئے
کتنے غم چُن کے دِل میں بسانا پڑا

ایسا لگتا ہے خود برق بیمار ہے
آشیاں خود ہی اپنا جلانا پڑا

ساقیا میکدے کا تھا رکھنا بھرم
بے پئے ہی ہمیں ڈگمگانا پڑا

اعتبارِ محبت نہ آیا اُنہیں
چیر کر سینہ، دل بھی دِکھانا پڑا

بچ گیا صاف وہ جو گنہگار تھا
میرے پیچھے ہی سارا زمانہ پڑا

دیکھ لو اپنے بیمار کا حالِ غم
کتنے صدمے تمہارے اٹھانا پڑا

پارسا یوں تو محمد بہت ہیں مگر
بات ایسی تھی اُن کو پلانا پڑا

○

غم کے سائے میں کٹ گئے لمحے
چین کے سارے چھٹ گئے لمحے

ایک فرصت کی آہ لے نہ سکے
کس قدر جلد گھٹ گئے لمحے

ہم کو منزل نصیب ہو جاتی
ٹیڑھی راہوں میں بٹ گئے لمحے

کیا بتائیں روش زمانے کی
جاتے جاتے پلٹ گئے لمحے

غم، تڑپ، آہ، درد، رنج، ستم
کتنے خانوں میں بٹ گئے لمحے

کتنے اہلِ خرد کے دل دہلے
بن کے بد بھتر جو پھٹ گئے لمحے

زندگی اپنی یوں کٹی امجد
کٹتے کٹتے ہی کٹ گئے لمحے

○

کبھی اِس جہاں کے کبھی اُس جہاں کے
ہزاروں ہیں قصّے زمین آسماں کے

غریبوں کو اتنا نہ ٹھکرائیے گا
یہ اپنے نہیں ہیں تو پھر ہیں کہاں کے

سنبھلکر ذرا ہاتھ تم دل پہ رکھنا
اُبھر آئے ہیں زخم دردِ نہاں کے

نہ جانے ہمیں کس موڑ پر جا کے ٹھہروں
مدارج ہیں باقی ابھی امتحاں کے

ہمیں چھوڑ کر ان کی محفل سجی ہے
یہاں کے وہاں کے تو ہم ہیں کہاں کے

کبھی زخم دل اور کبھی سرد آہیں
یہ لطف و کرم ہیں مرے پاسباں کے

یہ امجد کے چکّر سمجھ سے ہیں باہر
کلی کے ہیں پھیرے کبھی آسماں کے

جب اُن کی یاد آئی ایسا کیا ہے ہم نے
ہر زخم اپنے دل کا تازہ کیا ہے ہم نے

اچھوں سے کیا غرض ہے اچھوں کی بات چھوڑو
جتنے بُرے تھے ان کو اچھا کیا ہے ہم نے

رُودادِ غم سُنانا مقصود ہو گیا تھا
ان کی گلی میں جا کر جلسہ کیا ہے ہم نے

مائل نہ یہ جبیں ہے، مائل نہ اپنا دِل ہے
کس سنگِ در پہ جا کر سجدہ کیا ہے ہم نے

اوروں کا درد لیکر اوروں کے غم کو سہہ کر
دُنیا میں نام یارو اُونچا کیا ہے ہم نے

ہرگز ستم نہ ڈھانا اتنا خیال رکھنا
دِل دے کے آج تم کو اپنا کیا ہے ہم نے

کتنے ستم اٹھائے بس مسکرا کے امجد
اس زندگی کی خاطر کیا کیا، کیا ہے ہم نے

خیال

آیا جب سے خیال تمہارے نقاب کا
احساس ہو رہا ہے کچھ اپنے شباب کا

غیروں پہ نکتہ چینی کی عادت نہیں گئی
تجھکو بھی ہے خیال کچھ اپنے حساب کا

چہرے کو اپنے دیکھئے ہر چیز ہے عیاں
ہوتا ہے چہرہ آئینہ دل کی کتاب کا

جس نے ہماری زیست کو ویران کر دیا
اللہ بھلا کرے اُسی خانہ خراب کا

ساقی مجھے تو اتنا بتا دے یہ ماجرا
کیا بات ہے نشہ ہی نہیں ہے شراب کا

پھر کیا مجھے زمانہ ڈرائے گا دوستو
جب ہو گیا ہے ذہن مرا انقلاب کا

سہنی پڑے گی مجھ کو زمانے کی ہر سزا
شاہد اثر ہوا ہے کسی کے عتاب کا

بتلاؤ تم کہ کانٹوں میں کیسے اُلجھ گئے
مُرجھا گیا ہے آج جو چہرہ گلاب کا

امجد ذرا سنبھل کے رہو احتیاط سے
مشکل مقابلہ ہے ثواب و عذاب کا

دردِ دل کی دوا دیجئے ورنہ سُولی چڑھا دیجئے
ساقی جب سامنے ہے مرے جام و مینا ہٹا دیجئے

کم سے کم آپ اتنا کریں آگ دِل میں لگا دیجئے
آپ کو ڈھونڈ لونگا کہیں پہلے میرا پتہ دیجئے

ہے گزارش یہی آپ سے بس ذرا مُسکرا دیجئے
لگ نہ جائے خود اپنی نظر آئینہ کو چُھپا دیجئے

میکشی کا مزہ ہے یہی بس نظر سے پلا دیجئے
چاند بادل سے ہٹ جائیگا رُخ سے زُلفیں ہٹا دیجئے

مئے کشی رُک نہ جائے کہیں بادلوں کو دُعا دیجئے
گر نہیں ہے بھروسہ مرا گھر پہ پہرہ لگا دیجئے

پاس آجائیے بے خطر رسمِ دُنیا اُٹھا دیجئے
اے خدا یہ دُعا ہے مری راہ سیدھی دِکھا دیجئے

اس کو پانا ہی ٹھہرا اگر اپنی ہستی مٹا دیجئے

آج امجد بُرا حال ہے
اُن کو اتنا سُنا دیجئے

○

پہلی سی ہم پہ ان کی عنایت نہیں رہی
شائد اب ان کو اپنی ضرورت نہیں رہی

اگلی سی میرے دل کی وہ حالت نہیں رہی
اب دوستوں سے کوئی شکایت نہیں رہی

راہوں کے پیچ و خم میں کچھ الجھے ہیں ایسے ہم
اب رہبروں کی بھی ہمیں حاجت نہیں رہی

اس زندگی میں اتنے مصائب اٹھائے ہیں
جینے کی دل میں اب کوئی حسرت نہیں رہی

طاری تھا رعبِ حسن کچھ اس طرح دوستو
ان سے نظر ملانے کی ہمت نہیں رہی

مکر و فریب، جور و جفا بس یہی تو ہے
اس دور میں کہیں بھی صداقت نہیں رہی

کیسا نظام ہے کوئی چھوٹا بڑا نہیں
ہر گھر میں اب وہ طرزِ حکومت نہیں رہی

احباب و اقربا سبھی منہ موڑنے لگے
امجدؔ کے پاس جب سے کہ دولت نہیں رہی

یوں اپنے ہوش کھو کے پکارا نہ کیجیے
پتھر اُٹھا کے شیشے پہ مارا نہ کیجیے

مدت کے بعد آئے ہیں دِل توڑیے نہ یوں
اب اتنی جلد ہم سے کنارا نہ کیجیے

آیا ہے انقلابِ زمانہ تو غم نہیں
ہم نے یہ کب کہا کہ گزارا نہ کیجیے

بدنام ہو نہ جائیں کہیں آپ ہی حضور
محفل میں آ کے مجھ کو اشارا نہ کیجیے

ایمان ٹوٹ جائے نہ غیروں کا بھی کہیں
زلفوں کو اپنی اتنا سنوارا نہ کیجیے

گر مانگنا ہے شوق سے مالک سے مانگیے
انساں کے آگے ہاتھ پسارا نہ کیجیے

امجد پتے کی بات بتاتے ہیں دیکھیے
جو بات سچ نہیں ہے گوارا نہ کیجیے

نظر میں ہے منزل مگر دور ہے
کبھی ہے اندھیرا کبھی نور ہے

ہمارے لئے اور کیا چاہیئے
جو تو چاہتا ہے وہ منظور ہے

یہ فانی جہاں ہے ذرا سوچ لے
تو نشہ میں دولت کے مغرور ہے

تمہاری گلی کا جو دیدار ہو
تو میرے لئے بس وہی طور ہے

اگر دِل میں ہو جائے سچّی طلب
نہ میں دور ہوں اور نہ تو دور ہے

ضروری نہیں اس کو جام و سبو
وہ پی کر نظر سے جو مخمور ہے

مسرّت کی امید ضرورت نہیں
میرا دل غموں میں بھی مسرور ہے

جو گذرے ہیں وہ دن ابھی یاد ہیں
سہارے امیدوں کے آباد ہیں

عجب ذہن پر پڑ گئیں بیڑیاں
بظاہر دکھلانے کو آزاد ہیں

چمن لُٹ گیا، آشیاں جل گیا
زمانے کی نظروں میں آباد ہیں

کہاں شادمانی ہماری رہی
یہاں سب کے سب آج ناشاد ہیں

ادھر ہم پریشان کہ کیا ہوگیا
ادھر لے کے دل وہ بڑے شاد ہیں

چلے آیئے گھر ہے مقتل نہیں
نہ قاتل ہیں ہم اور نہ جلّاد ہیں

عجب ہے زمانے کی احمد روش
جو آباد تھے آج برباد ہیں

محبت کا شائد ستم بس یہی ہے
وہ آئے ہیں دل میں کرم بس یہی ہے

مری ہر جگہ پر ضرورت رہی ہے
زمانے میں میرا بھرم بس یہی ہے

تمہاری عنایت ہی مجھ پر نہیں ہے
میری زندگی کا الم بس یہی ہے

ذرا جانے والے ادھر بھی نظر کر
سرِ لوحِ مرقد رقم بس یہی ہے

نہ جانے کہاں سے کہاں تجھکو ڈھونڈا
جو دیکھا پلٹ کر حرم بس یہی ہے

گناہوں کی بخشش ہو میرے خدایا
نوازش تری ہے کرم بس یہی ہے

کبھی جھوٹا وعدہ، کبھی بے وفائی
مری جاں، تمہارا ستم بس یہی ہے

وہی میں ہوں امجد جسے تم نے ڈھونڈا
سنا ہے کہ اہلِ قلم بس یہی ہے

فسانے غموں کے سُنانے سے حاصل
جو گذرے ہیں صدمے دکھانے سے حاصل

نظر ان کی غیروں پہ مائل ہوئی ہے
وفائیں اب اپنی جتانے سے حاصل

کئی بار جس نے نشیمن جلایا
اُدھر ہاتھ اپنا بڑھانے سے حاصل

دُھواں آہ کا اُٹھ رہا ہے جگر سے
ابھی اور اُس کو جلانے سے حاصل

چمن کو تو لٹنا ہی تھا لُٹ گیا ہے
یہ شور و بُکا اب مچانے سے حاصل

ملے گا نہ کچھ بھی تمہیں اس جہاں میں
اُمیدوں کی دُنیا بسانے سے حاصل

خلافِ توقع وہ آئے مرے گھر
مگر ایسے بے وقت آنے سے حاصل

یقیں ہے کہ اب وہ نہ آئیں گے ہرگز
جُدائی کے صدمے اُٹھانے سے حاصل

نہیں جس کو احساس ہی غم کا امجد
اُسے داغِ دِل کے دکھانے سے حاصل

سویرے سویرے یہ کس کی صدا ہے
ملاقات کی یہ نرالی ادا ہے

عجب کیفیت ہے تیری رہگذر پر
کہ سارا جہاں آج تجھ پر فدا ہے

زمیں آسماں کا تو، تو ہی ہے مالک
جہاں دیکھتا ہوں میں جلوہ ترا ہے

مزاجِ زمانہ سمجھ میں نہ آیا
کہ خونِ غریباں ہی ہردم بہا ہے

وہ آئیں مرے گھر یہ امکاں نہیں ہے
مری ان کی نظروں میں وقعت ہی کیا ہے

محبت نے ہم کو کہاں لا کے چھوڑا
نہ اُن کا پتہ ہے نہ اپنا پتا ہے

بظاہر یہ دیر و حرم کے ہیں جھگڑے
حقیقت میں منزل کا یہ سلسلہ ہے

چلے آؤ امجد گلے ہم ملیں گے
خلوص و محبت سے سب کچھ ملا ہے

اک مستقل مقام مرے دل نے پا لیا
خوشیوں نے ساتھ چھوڑ دیا غم بسا لیا

الزام سارے نام پر اپنے لگا لیے
رسوائیوں سے آپ کو لیکن بچا لیا

ایسا نہ ہو کہ برق ہی لے لے لپیٹ میں
یہ سوچ کر ہی اپنا نشیمن جلا لیا

احوال اُن سے پوچھنا اپنا غضب ہوا
دُنیا نے اتنی بات کو طوفاں بنا لیا

آنے کا اُس نے خواب میں وعدہ کیا مگر
مارے خوشی کے میں نے گھر اپنا سجا لیا

پوچھا کسی نے پیار کا مطلب بتائیے
پھر کیوں خطیبِ وقت نے سر کو جھکا لیا

عزت نہ ہو نصیب تو بہتر ہے موت ہی
اس فلسفے سے جینے کا ہر راز پا لیا

اپنوں نے ہم کو صدمے کچھ اس طرح دیئے
اپنوں کو چھوڑ غیر کو اپنا بنا لیا

لذت تھی ایک جلنے کی غم کے الاؤ میں
امجد کو تم نے کس لئے بڑھ کر بچا لیا

دِل سے دِل کو رغبت ہے
بات یہ غنیمت ہے

رہگذر ملی تیری
یہ ہماری قسمت ہے

زندگی کے متوالو
موت ہی میں لذّت ہے

دِل کی بات ہے اِتنی
آپ سے محبّت ہے

اُن کی آنکھوں سے پی لی
مَیکشی کی لذّت ہے

دوسروں کے کام آنا
یہ بھی اک عبادت ہے

اُن کی جو کہانی ہے
وہ مِری حقیقت ہے

کِس طرح سے جیتے ہیں
بس خدا کی قدرت ہے

مُشکلوں سے ہی امجد
زندگی کی راحت ہے

مجھ سے نظر ملاؤ مگر احتیاط سے
جی بھر کے تم پلاؤ مگر احتیاط سے

اب میرے حال زار پہ اتنا کرم تو ہو
ظلم و ستم بھی ڈھاؤ مگر احتیاط سے

ایسا نہ ہو کہ غیر پہ کھل جائے ماجرا
محفل میں تم بلاؤ مگر احتیاط سے

وابستگی یہ غیر سے کب تک مرے حضور
عزّت مری بڑھاؤ مگر احتیاط سے

مرنے تمہارے واسطے تیار ہے کوئی
اب زندگی بچاؤ مگر احتیاط سے

اُن کی گلی ہے موت کی میری خبر نہ ہو
میّت مری اُٹھاؤ مگر احتیاط سے

بدنام ہو نہ جاؤ کہیں سوچ لو ذرا
امجد سے دل لگاؤ مگر احتیاط سے

○

زندگی کو عذاب کہتے ہیں
آرزو کا سراب کہتے ہیں

دامن اپنا بچا کے چلنے پر
لوگ خانہ خراب کہتے ہیں

سب سے ملتی ہیں آپ کی نظریں
آپ اسی کو حجاب کہتے ہیں

دیکھ کر اُن کی نرگسی آنکھیں
ہم نظر کو شراب کہتے ہیں

جو بھی پڑھتے ہیں میرے چہرے پر
آپنے دِل کی کتاب کہتے ہیں

دیکھ کر آپ کا حسین چہرہ
ہم تو تعبیر خواب کہتے ہیں

آپ پر اُٹھتی ہے نظر اپنی
لوگ جب ماہتاب کہتے ہیں

بات کیا ہے بشیر امجد کو
لوگ عالی جناب کہتے ہیں

○

اپنی آنکھوں کے چشمے اُبلتے گئے
دِل کے جذبات یونہی مچلتے گئے

ٹھوکریں ہی ملیں زیست کی راہ میں
پھر بھی ہر ہر قدم پر سنبھلتے گئے

جام اپنا تو خالی کا خالی رہا
جام رندوں کے خالی بدلتے گئے

سب کے گھر میں تھا جشنِ چراغاں مگر
اک ہم تھے محبت میں جلتے گئے

یہ بتا تو نے کیا خاک ہم کو دیا
زندگی، تیرے سانچے میں ڈھلتے گئے

آج تک بھی نہیں، تجھکو پاسِ وفا
تیری ہر سانس پہ ہم مچلتے گئے

اپنی منزل سے امجد نہیں کچھ غرض
ہم کو چلنا تھا ہر حال چلتے گئے

○

وقفِ ماتم جو رو گیا کوئی
کس قدر تھک کے سو گیا کوئی

آپ خوشیاں سمیٹ لائے ہیں
غم کی وادی میں کھو گیا کوئی

بوند پلکوں پہ تھی بہت زیبا
منہ کو شبنم سے دھو گیا کوئی

غم کے ساحل سے باندھ رکھا تھا
دل کی کشتی ڈبو گیا کوئی

دل میں ہوتی ہے کیسی یہ ہلچل
پیار کا بیج بو گیا کوئی

غیر امجد منائیے اپنی
آج بیگانہ ہو گیا کوئی

غضب ڈھا گیا ہے تبسّم کسی کا
اچانک لُٹا دِل کسی اجنبی کا

ہر اک گام پر صرف کانٹے ہی کانٹے
صِلہ ہم کو اتنا ملا زندگی کا

ذرا پی کے رِندو نہ مدہوش ہونا
طریقہ نہیں ہے یہ بادہ کشی کا

بنا ڈالا دیوانہ کتنوں کو لوگو
پتہ پوچھتے ہیں وہ میری گلی کا

خودی کو جو اپنی نہ قُربان کر دے
مزہ کوئی کیا جانے گا بندگی کا

ذرا دور سے یارو کر لو نظارا
یہ حُسنِ مجسّم ہے کِس دلکشی کا

گُذرنے کو یوں بھی گذرتی ہے امجد
نہ پوچھے کوئی حال اب بے بسی کا

ہم نے اتنے فریب کھائے ہیں
اب زمانے سے باز آئے ہیں

ہم کو مسرور وہ سمجھتے ہیں
ہم بظاہر جو مسکرائے ہیں

پوچھیے اس سے پھول کی لذت
جس نے کانٹوں سے زخم کھائے ہیں

زلف اپنی ہٹاؤ چہرے سے
روشنی مانگنے کو آئے ہیں

اپنے آنچل کا دیجیے سایہ
غم کی ہم دھوپ کھا کے آئے ہیں

ہم کو نفرت سی ہے مسرت سے
دل نے غم اس قدر اٹھائے ہیں

اک عالم سمٹ کے آیا ہے
سامنے میرے جب وہ آئے ہیں

بڑھ کے امجد کو کچھ سہارا دو
لاش اپنی اٹھا کے لائے ہیں

ملیں ان سے نظریں غضب ہوگیا ہے
ملاقات کا اک سبب ہوگیا ہے

وہ آئے گئے پھر نہ آئے پلٹ کر
یہ کیا ہوگیا اور کب ہوگیا ہے

تمہاری ادا تیر برسا رہی ہے
مرا پیار بھی باادب ہوگیا ہے

کہاں ہے وہ چاہت، کہاں ہے وہ الفت
زمانے کا نقشہ عجب ہوگیا ہے

کچھ اس موڑ پر آگئی زیست آہی
کہ دل درد سے جاں بلب ہوگیا ہے

سدا مجھ پہ احسان ہے میرے مالک
کہ جو بھی ہوا بے طلب ہوگیا ہے

نہیں ہے زمانے کا اب خوف کوئی
کہ امجد کا دل سوئے رب ہوگیا ہے

حُسن کا یہ کمال ہے یارو
جاں اپنا نڈھال ہے یارو

آشیاں کا خدا ہی حافظ ہے
بجلیوں کو جلال ہے یارو

ساری دُنیا کو ہے خیال برا
مجھ کو ان کا خیال ہے یارو

بخش دو کچھ سکون ہم کو بھی
جینا اپنا محال ہے یارو

موت سے دوستی ہی بہتر ہے
زندگی اِک وبال ہے یارو

اب کہاں کا خلوص کیسا پیار
بس فریبوں کا جال ہے یارو

آج امجد نے توڑ دی توبہ
میکشی کا خیال ہے یارو

نئی روشنی ہے نئے سب دیئے ہیں
اُجالوں سے ہم نے اندھیرے لیئے ہیں

خوشی سے نہیں ہم کو تھوڑی بھی رغبت
مُصیبت کو سہہ سہہ کے آنسو پیئے ہیں

چلو باغبان منحرف ہے تو کیا ہے
یہ تحفے تو آزادیوں نے دیئے ہیں

نہ ساحل سے مطلب نہ موجوں کی پرواہ
سدا رہ کے طوفان میں ہم جیئے ہیں

ہمیں کیا نہیں کہہ رہا ہے زمانہ
مگر ہم نے دانستہ لب سی لیئے ہیں

بھلا کیسے میں دور اُن کو رکھوں گا
ہیں محفوظ سب غم جو تم نے دیئے ہیں

زمانہ ہمیں کیا بھلائیگا احمد
کہ ایسے بھی کچھ کام ہم نے کیئے ہیں

وہ جو اب دور ہوا جاتا ہے
اک نیا درد بڑھا جاتا ہے

سامنے جام جو آجاتا ہے
پھر بھلا کس سے رہا جاتا ہے

ظرف جب بیچنے لگ جائے کوئی
خود بہ خود دام گھٹا جاتا ہے

اُن سے اُمید ملاقات نہیں
مرحلہ سخت ہوا جاتا ہے

اور بڑھ جاتی ہے بیتابئ دل
جب بھی وہ بام پہ آجاتا ہے

اُس کو مل جاتی ہے منزل اک دن
جب کوئی آبلہ پا جاتا ہے

بزم سونی سی ہوئی جاتی ہے
اُٹھ کے امجد جو چلا جاتا ہے

تقدیر کی باتیں تھیں تدبیر نہ کی ہم نے
تحقیر تو اُس نے کی تحقیر نہ کی ہم نے

دُنیا نے تو کرنے کو کیا کیا نہ برائی کی
خاموش رہے پھر بھی تشہیر نہ کی ہم نے

رودادِ محبت کا، عالم ہی نرالا تھا
کچھ سوچ کے کاغذ پر تحریر نہ کی ہم نے

دِل غم سے جُدا ہو کر کیا خاک بھلا جیتا
دیکھا جو کھنڈر دل کا تعمیر نہ کی ہم نے

سینے سے لگا رکھا، آنکھوں میں چھپا ڈالا
والپس تری آنکھوں کی تصویر نہ کی ہم نے

دِل اپنا جو مائل ہو، کچھ کام بھی بنتا ہے
بھیجے لاکھ ادب پرور تقریر نہ کی ہم نے

ہم صاحبِ میخانہ ہر وقت رہے امجد
لیکن تری آمد کی تشہیر نہ کی ہم نے

O

مجھے اور تھوڑی پلا ساقیا
کمی رہ نہ جائے ذرا ساقیا

مقدّر ہمارا بدل جائیگا
ذرا جام اُٹھا، جام اُٹھا ساقیا

مرا کیا ہے میں ایک میخوار ہوں
ذرا شیخ جی کو پلا ساقیا

تجھے اس کا اندازہ شاید نہیں
جو ہے آگ دِل میں بجھا ساقیا

چلے آئے ہیں زاہدِ خشک بھی
ذرا میکدے کو سجا ساقیا

فقط مانگتا ہے جو جام و سبو
وہ میخوار ہے یا گدا ساقیا

بھٹکتا ہے انجمؔ نہ جانے کہاں
بڑا سُونا ہے میکدہ ساقیا

جو دور ہو گیا ہے اُسے یاد کیا کروں
ہونا جو تھا وہ ہو چکا، فریاد کیا کروں

اُمید کچھ ہے اور نہ دل میں کچھ آرزو
ایسے میں اپنے آپ کو میں شاد کیا کروں

آرام چین کا تو کوئی ذکر کیا کرے
غم دیدہ جس کا دل ہو اسے شاد کیا کروں

ضائع نہ کیجئے دل پہ اب اپنی عنایتیں
جو خود ہی لُٹ گیا اُسے آباد کیا کروں

جو خود ہی تیری زلف کے زنداں میں قید ہو
اُس دل کو تیری قید سے آزاد کیا کروں

حق گوئی حق پسندی مرا فرض منصبی
اس سلسلے میں گر پڑی افتاد کیا کروں

امجد مجھے تو سود و زیاں کا نہیں خیال
جو کچھ ہوا، ہوا، میں اُسے یاد کیا کروں

فریبِ نظر میں جو ہم کھو گئے ہیں
تڑپ کر تری یاد میں سو گئے ہیں

نہ پوچھا کسی نے بھی احوال اپنا
تماشا جہاں کے لیئے ہو گئے ہیں

پلٹ کر وہ اب تک دوبارہ نہ آئے
جو گھر سے نکل کر گئے سو گئے ہیں

ابھی تک تری یاد باقی ہے دِل میں
ترے شہر سے لاکھ ہم تو گئے ہیں

ابھی تک بھٹکتے ہیں صحرا میں ہمدم
تری بزم سے اُٹھ کے ہم جو گئے ہیں

بتاؤ کوئی کیسے سرسبز ہوگا
تباہی کے جب بیج وہ بو گئے ہیں

ہمیں فکرِ منزل نہیں کوئی امجد
جہاں نیند آئی وہیں سو گئے ہیں

دِل میرا لگ گیا ہے کسی اجنبی کیساتھ
وابستہ ہر خوشی ہے اسی کی خوشی کے ساتھ

آتش کدہ ہے دِل مرا، ہر سانس شعلہ پوش
کیا کیا مِلا ہے مجھ کو تری بے رُخی کے ساتھ

ناکامیوں نے جب سے بُرا حال کر دیا
تیرے قریب آئے ہیں ہم بندگی کے ساتھ

کاکُل سنوارنے میں نہ یوں دیر کیجیئے
جو کچھ ہوا، ہوا ہے یہ دِل کی لگی کے ساتھ

ہیں لوگ گُل پرست تو مطلب نہیں ہمیں
ہمدردیاں جو اپنی ہیں سُوکھی کلی کے ساتھ

ہر دن ہمارا، ہو کے رہا نذرِ حادثات
ہر رات کٹ رہی ہے فقط بے کلی کے ساتھ

اک لمحہ مل سکی نہ مسرّت کی چھاؤں بھی
ہر وقت حادثے ہیں مری زندگی کے ساتھ

افتادگی، تباہی، پریشانی، بےکسی
مرمر کے جی رہے ہیں تمہاری خوشی کے ساتھ

امجدؔ مجھے تباہی کا کوئی بھی غم نہیں
زاہدؔ بھی چل رہے ہیں مری میکشی کے ساتھ

تو لاکھ آئے زاہد حلیہ بدل بدل کے
سب تجھ کو جانتے ہیں بیٹھا ذرا سنبھل کے

گھر میں بھی کب سکوں تھا گھر کاٹنے چلا تھا
پھرتا ہے مارا مارا گھر سے بھی وہ نکل کے

پھر کارواں کا یارو اللہ ہی ہے محافظ
رہبر جو تھک گیا تو بس دو قدم ہی چل کے

بھٹکو گے کب تلک تم، یہ سوچنا ہے تم کو
ہر گام پر ہے دھوکا، چلنا ذرا سنبھل کے

اہلِ خرد کی باتیں ہم کو نہ اب سناؤ
ہیں جتنے عقل والے گرنے لگے پھسل کے

ہے وقت کا تقاضا مضبوط خود کو کر لو
مکر و فریب کو تم رکھ دو ذرا کچل کے

میں خود ہی منتظر تھا دنیا سے تنگ آ کر
صدقے میں کیوں نہ جاؤں بڑھ کر مری اجل کے

اب کیا خوشی میں مانگوں نفرت سی ہو گئی ہے
ارمان بہہ گئے ہیں سب آنسوؤں میں ڈھل کے

کیا خاک زندگی میں فرصت ملے گی امجد
اب بھی وہ مرحلے ہیں جو مرحلے تھے کل کے

○

چمن کی فضا میں دھواں ہی دھواں ہے
گلوں کا لہو ہر روش پر رواں ہے

چمن کی سیاست سمجھ میں نہ آئی
بہاروں کے موسم میں رنگِ خزاں ہے

غریبوں کی حالت کچھ ایسی ہوئی ہے
نہ کھانے کو کھانا، نہ رہنے مکاں ہے

تصوّر میں میرے وہ ایسے بَسے ہیں
ہر آہٹ پہ دِل کو انہیں کا گماں ہے

بھلا اس کو دوری میں کیسے کہوں گا
وہاں تو ہی تو ہے میرا دِل جہاں ہے

مجھے ڈر نہیں وقت کی گردشوں کا
میں اُس کا ہوں اور وہ مرا پاسباں ہے

ہر اک نام لیتا ہے امجد کا لوگو
سُنا ہے وہ محفل کی روحِ رواں ہے

درد و غم ساتھ اپنے بچا لے گئے
یاد تیری جو دل میں بسا لے گئے

روز و شب امتحان اپنا ہوتا رہا
روز و شب درد و غم میں ہی پالے گئے

خود بخود دِل ہمارا بھی مائل ہوا
عید آتے ہی ساغر سنبھالے گئے

کوئی ہمدم نہ مونس ملا عُمر بھر
لے کے ہم زندگی کے اُجالے گئے

آ کے بیٹھے نہ تھے آپ کی بزم میں
بے رُخی سے وہاں سے نکالے گئے

خود ہی رُسوا ہوئے خود پریشاں رہے
دوش پر بوجھ ان کا اُٹھا لے گئے

لاکھ چھپتے رہے، لاکھ بچتے رہے
ہو کے ہم خود اجل کے حوالے گئے

جب سے امجد چلے میکدہ چھوڑ کر
تب سے ساقی گیا وہ پیالے گئے

ان کو میرا خیال ہے یارو
اب طبیعت بحال ہے یارو

ڈھونڈتا ہوں پتہ نہیں ملتا
بس اسی کا ملال ہے یارو

اک مدّت سے وہ نہیں دل میں
پھر بھی ان کا خیال ہے یارو

زلف کی چھاؤں میں کٹی جب سے
زندگی بے مثال ہے یارو

میکدہ آج خالی خالی ہے
میکشی کا سوال ہے یارو

چشمِ نرگس کی تاب لا بھی سکوں
کب مری یہ مجال ہے یارو

دل میں رکھّے مجھے کہ ٹھکرا دے
یہ اُسی کا کمال ہے یارو

بن گیا جب سے آشیاں اپنا
بجلیوں کو جلال ہے یارو

در و دیوار کی بھی ہیں آنکھیں
چھُپ کے ملنا محال ہے یارو

حال پوچھو نہ ہم سے امجد کا
دِل شکستہ نڈھال ہے یارو

جن کے لئے مرے وہی دِلبر نہیں ملے
ملتے رہے کبھی کبھی اکثر نہیں ملے

پھولوں کو گر نچوڑ دوں اپنا لہو گرے
اہلِ چمن کو میرے برابر نہیں ملے

گردن کٹانے ہم ہی چلے آئے شوق سے
اور آپ کہہ رہے ہیں کہ خنجر نہیں ملے

یوں وقت کے تقاضوں نے مجبور کر دیا
ہم خود ہی اپنے آپ سے اکثر نہیں ملے

منزل کی آرزو میں پتہ پوچھتے رہے
یہ اور بات ہے ہمیں رہبر نہیں ملے

حملے ہزار بار مرے دِل پہ ہو گئے
محفوظ دِل رہا کبھی نِشتر نہیں ملے

دِل اور جان، نام یہ ان کے ہوئے نثار
اس پہ بھی عذر یہ ہے کہ کھُل کر نہیں ملے

بزمِ سخن کی بات ہے رنگین بزم ہے
کیسے کہے گا کوئی سخنور نہیں ملے

ساقی خفا خفا سا ہے تم بھی بہت اُداس
امجد بتاؤ کیا تمہیں ساغر نہیں ملے

جو دل ہے ہمارا ہمارا نہیں ہے
شبِ غم کا کوئی کنارا نہیں ہے

چمن کی فضا راس آئی نہ ہم کو
کہ بجلی کا اب تک شرارا نہیں ہے

اگر آپ چاہیں بصد شوق آئیں
یہ دل ہے کسی کا اجارا نہیں ہے

سر اونچا رہا ہے جہاں بھی رہے ہم
کبھی اپنا دامن پسارا نہیں ہے

یہ کیا بات ہے کیوں پلٹ آگئے ہم
کسی نے تو ہم کو پکارا نہیں ہے

تھے خوش حال تو ہر کوئی تھا ہمارا
مصیبت میں کوئی ہمارا نہیں ہے

پریشان کیوں اتنے ہوتے ہو امجد
تمہیں کیا خدا کا سہارا نہیں ہے

O

آپ کی آنکھ آج نم کیوں ہے
مرنے والے پہ یہ کرم کیوں ہے

کیا خطا مجھ سے ہو گئی سرزد
عمر ساری یہ رنج و غم کیوں ہے

حرف آئے گا میکدے پہ ترے
مئے پلائی مگر، وہ کم کیوں ہے

ان کو ہم سے اگر نہیں الفت
بھیگا دامن ہے آنکھ نم کیوں ہے

جس طرف دیکھئے ہے مایوسی
زندگی مستقل الم کیوں ہے

ان کے وعدے کبھی وفا نہ ہوئے
اس قدر رنج و غم، ستم کیوں ہے

بات کیا ہے بتایئے امجد
اتنا روٹھا ہوا صنم کیوں ہے

○

افتادِ طبیعت کی سنبھلنے نہیں دیتی
چھائی ہے گھٹا ہر سو نکلنے نہیں دیتی

تدبیر تو ہر حال میں تدبیر ہے لیکن
بدلی ہوئی قسمت تو بدلنے نہیں دیتی

مجبور ہے... دل میرا خوش ہوگا تو کیسے
ویرانے کی حالت تو بہلنے نہیں دیتی

کیا بُغض ہے دنیا کو محبت کی ہے دشمن
اُلفت کی کوئی بات بھی چلنے نہیں دیتی

پابندِ سلاسل نہیں، پھر بھی ہوں مقید
زنداں کی محبت تو نکلنے نہیں دیتی

اے برق ذرا کیجیو اقدام سنبھل کر
برسات نشیمن میرا جلنے نہیں دیتی

امجد رہو گمنام بھلائی ہے اسی میں
شہرت کبھی انساں کو سنبھلنے نہیں دیتی

وہ بظاہر عجیب ہوتے ہیں — دل کے لیکن قریب ہوتے ہیں
ڈھونڈنے پر بھی وہ نہیں ملتے — یوں ہمارے نصیب ہوتے ہیں

پیار جب آپ کا ستاتا ہے — ہم غموں سے قریب ہوتے ہیں
کون ان کی شرارتیں سمجھے — دیکھنے میں غریب ہوتے ہیں

پیار کرنا کوئی گناہ نہیں — پیار سے سب قریب ہوتے ہیں
جس قدر ظلم ان کا بڑھتا ہے — زخم دل کے مہیب ہوتے ہیں

دشمنوں کا یہاں پہ ذکر ہی کیا — دوست بھی تو رقیب ہوتے ہیں
دل کی دھڑکن یہ صاف کہتی ہے — وہ بظاہر حبیب ہوتے ہیں

ان کے دامن میں ہے خوشی ساری — ہم کو غم ہی نصیب ہوتے ہیں

دل جلانے کے واسطے امجدؔ
ساتھ ان کے رقیب ہوتے ہیں

درد پنہاں ہے لا دوا شائد
موت ہی ہے اِک آسرا شائد

میری آنکھوں میں دیکھ کر آنسو
دامن اس کا بھی تر ہوا شائد

غنچے کھلنے لگے ہیں چاروں طرف
دستِ نازک کوئی لگا شائد

اس قدر کیوں بہک رہے ہیں قدم
زیست کا موڑ ہے نیا شائد

زاہدِ خشک آج تھک تھک کر
میکدے کو چلا گیا شائد

تارے گن گن کے رات گذری ہے
حالِ دل ہو گیا بُرا شائد

اتنی امجد یہ بے قراری کیوں
تیر دل پر کوئی لگا شائد

○

جب بھی وہ اپنا پیار دیتا ہے
دِل کی دُنیا سنوار دیتا ہے

اتنا آساں نہیں ہے دِل دینا
دِل بھی کوئی اُدھار دیتا ہے

اِک ذرا سا کرم ترا اکثر
بوجھ دِل کا اُتار دیتا ہے

عشق سَر چڑھ کے بول دے جو کبھی
حُسن ان کا نکھار دیتا ہے

اپنا اپنا محاسبہ کر لیں
کون اب کتنا پیار دیتا ہے

زندگی اس کی کامیاب نہیں
حوصلہ جو بھی ہار دیتا ہے

عزم ہو جائے گر جواں امجدؔ
خشک پودا بہار دیتا ہے

جہاں پہ چشمِ ساقی اثر کر گئی
فضا میکدے کی سحر کر گئی

نگاہوں کا ملنا غضب ڈھا گیا
محبت مرے دل میں گھر کر گئی

مرا پیار سب پر عیاں ہو گیا
صبا جاتے جاتے خبر کر گئی

بُعد دوں میں تجھکو یہ ممکن نہ تھا
تری یاد آنکھوں کو تر کر گئی

ملاقات کی آس باقی نہ تھی
شبِ ہجر تھک کر سحر کر گئی

تری داستان اتنی لمبی رہی
کہانی مری مختصر کر گئی

وقارِ حیات امجد ایسا رہا
مرے پاس سے موت ڈر کر گئی

○

شبِ ہجر ایسی کٹی جا رہی ہے
ہر اک سانس میں زندگی جا رہی ہے

نگاہِ کرم اُس کی جب سے ہے ہم پر
اُمیدوں کی دنیا بسی جا رہی ہے

کوئی میکدہ ہو کوئی انجمن ہو
کہانی ہماری سُنی جا رہی ہے

خدا ہی مرا ناخدا بن گیا ہے
کنارے سے کشتی لگی جا رہی ہے

کہیں وہ نہ بھُولے سے اظہار کر دے
محبت ابھی تک چھُپی جا رہی ہے

خلافِ توقع پیام ان کا آیا
مری آنکھ سے نیند اُڑی جا رہی ہے

چمن کی فضا راس آئی نہ امجد
تباہی ہماری بڑھی جا رہی ہے

○

تری ہر ہر ادا نرالی ہے
تو ہے سادہ مگر کمالی ہے

سوچتا ہوں جواب کیا دوں گا
ان کی ہر اک نظر سوالی ہے

میری روداد غم تو سُن ڈالی
اُس نے گردن مگر جھکالی ہے

حشر اپنا نہ جانے کیا ہوگا
ہاتھ کی طرح دِل بھی خالی ہے

تیری بے اعتنائیوں نے میرے
دِل کی ہر آس توڑ ڈالی ہے

آج مستی کا ہے عجب عالم
"میکشی عید کی نرالی ہے"

آپ کا پیار جان سے پیارا
آپ کا حُسن بے مثالی ہے

سب نے لوٹا ہے میکدہ امجدؔ
صرف اک میرا جام خالی ہے

○

زندگی اِک عذاب ہے لوگو
حادثوں کی کتاب ہے لوگو

جو حقیقت نہ جانے آپ اپنی
اس کا خانہ خراب ہے لوگو

پیار اُلفت کہاں سے لائیں گے
بزمِ دنیا سراب ہے لوگو

قدرِ انسانیت نہیں باقی
یہ عجب انقلاب ہے لوگو

کون ایسے میں کس کو پہچانے
سب کے رُخ پر نقاب ہے لوگو

بڑے چھوٹے کا اب ہے فرق کہاں
اگلی تہذیب خواب ہے لوگو

جستجو کی یہاں ضرورت ہے
ہر چمن میں گلاب ہے لوگو

آج امجد کا حال کیا کہئیے
رنج و غم کی کتاب ہے لوگو

ستانا ہے جتنا مجھے تو ستا لے
نہ کرنا مگر دوسروں کے حوالے

تڑپ بجلیوں کی سنبھلنے نہ دیگی
نشیمن کو اپنے ذرا خود جلا لے

نگاہِ محبت نہ ہو جائے رُسوا
زمانے کی نظروں سے اس کو چھپا لے

یہاں پر نہیں ہے کوئی میرا ہمدم
نبھانا ہے تجھکو، تو تو ہی نبھا لے

تصوّر میں تیرے دگرگوں ہوا ہوں
تو اپنا بنا لے کہ نظریں چرا لے

اُمیدِ کرم پر جئے جا رہا ہوں
ملیں گے کبھی تو، مجھے بھی اُجالے

تجھے دیکھنے کو ترستی ہیں آنکھیں
من و تو کے سارے حجابات اٹھا لے

یہی اِک دُعا تجھ سے کرتا ہے امجدؔ
گنہوں سے یارب تو اُس کو بچا لے

○

شب و روز موسم بدلتے رہے
کہ ہم غم کے سانچوں میں ڈھلتے رہے

محبت، وفا، دوستی، اتفاق
بنا کر کھلونے بہلتے رہے

خبر تھی کہ منزل نہیں ہے کوئی
مگر ہم کو چلنا تھا چلتے رہے

چراغِ محبت زمانے میں ہم
جلاتے رہے اور جلتے رہے

ملا کیا، گیا کیا، کسے یاد ہے
گرے بھی اگر ہم سنبھلتے رہے

جو دیکھا انہوں نے ہمیں پیار سے
بس ارمان دل میں مچلتے رہے

روش اپنی امجد نے بدلی نہیں
کئی لوگ چہرے بدلتے رہے

غموں کے سہارے جیا کیجیے
یہی زندگی ہے تو کیا کیجیے

اِشاروں پہ ان کے چلا کیجیے
محبّت کا حق یوں ادا کیجیے

ستم اُنکے جب حد سے بڑھ جائینگے
سُنا کیجیے اور سہا کیجیے

مصائب زمانے کے چھٹ جائینگے
زباں سے نہ اُف تک کیا کیجیے

تقاضے ہیں زندہ دِلی کے یہی
ہوں غم لاکھ پھر بھی ہنسا کیجیے

عجب زندگانی کی ہے کشمکش
نظاروں کا ماتم کیا کیجیے

اگر اُس کی مرضی ہے پیشِ نظر
ہر اِک زخم دِل کا سِیا کیجیے

وہ آئیں نہ آئیں الگ بات ہے
پیامِ محبّت دیا کیجیے

مسائل کا حل جبکہ ممکن نہیں
تو خون آپ اپنا پیا کیجیے

یہ پینا، پلانا ہے آساں مگر
جہاں کی نظر سے بچا کیجیے

لکھا ہے مقدّر میں امجد یہی
کہ طعنے ہر اک کے سُنا کیجیے۔

○

زندگی یوں بسر نہ ہو جائے
روتے روتے سحر نہ ہو جائے

حالِ دل کی خبر نہ ہو جائے
دل پہ اس کے اثر نہ ہو جائے

شبِ غم مختصر نہ ہو جائے
یا الٰہی سحر نہ ہو جائے

کس قدر ہو گئی ہے تنگ نظر
دوستی پُرخطر نہ ہو جائے

ابھی جاؤ کہ رات باقی ہے
زندگی کی سحر نہ ہو جائے

آپ آئیں تو بات بنتی ہے
بے مزہ یہ سفر نہ ہو جائے

آئینہ کو ذرا ہٹا دیجئے
آپ اپنی نظر نہ ہو جائے

دل کی بستی اجڑ چکی امجد
اس کی سب کو خبر نہ ہو جائے

ذرا سوچ کر دِل کسی سے لگانا
کہیں لُٹ نہ جائے یہ دِل کا خزانا

کسی کے فریبِ نظر میں نہ آنا
جو ہے دِل میں اپنے وہی کر دِکھانا

زمانے کے فتنے ستاتے رہیں گے
مصائب میں ہرگز نہ تم ڈگمگانا

ستم یا کرم ہو، یہ ان کی نوازش
جو ہے بوجھ اپنا وہ خود ہی اٹھانا

عجب حال میں زندگی کٹ رہی ہے
نہ اپنا ٹھکانا، نہ دل کا ٹھکانا

فسانہ حقیقت کا کیا روپ لیگا
حقیقت ہی اب بن گئی ہے فسانا

ہر اک در پہ امجدؔ نہ سر کو جھکاؤ
درِ یار پر ہی سر اپنا جھکانا

○

وہ زُلفوں میں اَپنی پھنسا لے گئے
جو تھا چین دل کا اُڑا لے گئے

رہا کب ہے اب اپنے سینے میں دل
وہ پہلی نظر میں چُرا لے گئے

بتائیں تمہیں کس طرح دوستو
ہنسی وہ ہماری اُڑا لے گئے

محبت کا کیسے نہ ہم نام دیں
وہ پلکوں میں آنسو چھپا لے گئے

ذرا آخرت کا بھی سامان کر
گئے جو یہاں سے وہ کیا لے گئے

نہ غمخوار کوئی نہ ہے ہم نوا
مصائب ہمیں خود بچا لے گئے

شبِ ہجر امجدؔ کٹی اس طرح
جو تھے چند آنسو بچا لے گئے

جب فضا کچھ اداس ہوتی ہے
زندگی بد حواس ہوتی ہے

تشنہ لب ہوں ذرا پلا ساقی
آج شدت کی پیاس ہوتی ہے

ہم کو احساسِ جرم ہوتا ہے
جب سزا بے قیاس ہوتی ہے

اک قیامت ہے ہر نظر اُن کی
کتنی مردُم شناس ہوتی ہے

یوں بظاہر وہ دور ہے مجھ سے
یاد اُس کی تو پاس ہوتی ہے

جس کو کہتے ہیں لوگ سب اُلفت
زیست کی وہ اساس ہوتی ہے

ان کا جب بھی خیال آتا ہے
ان کے آنے کی آس ہوتی ہے

جب بھی احساس ہو جدائی کا
زیست اپنی اُداس ہوتی ہے

سامنے وہ ہوں تو بشیر امجد
خامشی التماس ہوتی ہے

خموشی کا مطلب رضا تو نہیں ہے
چھپایا ہے مکھڑا اخفا تو نہیں ہے

ذرا سوچ لو پاس آنے سے پہلے
یہ رازِ محبت کھلا تو نہیں ہے

کبھی دور جانا، کبھی پاس آنا
بنامِ جفا یہ وفا تو نہیں ہے

تڑپتے ہی رہنا سدا زندگی میں
کہیں ان کی یہ بد دعا تو نہیں ہے

سکون چین جانے کدھر کھو گیا ہے
مقدر میں لکھی سزا تو نہیں ہے

نہ ساقی نہ مے خوار ہے اس جگہ پر
کہیں میکدہ یہ لٹا تو نہیں ہے

تڑپنا مچلنا سدا کا ہے امجد
کوئی میرے پیچھے بلا تو نہیں ہے،

○

ہجر کی شب، یاد اس کی آ گئی
دل پر اک دیوانگی سی چھا گئی

دیکھئے کالی گھٹا کیا آ گئی
میکدے کی سرزمیں گرما گئی

پیرہن ہونے لگا ہے تار تار
حادثوں سے زندگی تھرا گئی

دیدہ زیبی کے لئے تھا آئینہ
جب نظر اس کی پڑی شرما گئی

غم سے دل کا حال ایسا ہو گیا
جس طرح چیونٹی شکر کو کھا گئی

جھوم کر خوشیاں مناؤ دوستو
عید آزادی کو لے کر آ گئی

ڈر سے گلچیں کے بپا کہرام ہے
دیکھ لو ہر اک کلی مرجھا گئی

میکدے کا میکدہ انجان تھا
تشنگی امجد کو کیا ترسا گئی

سوزشِ غم میں جلے اور بڑھے
جتنا جلنا تھا جلے اور بڑھے

شبِ غم یاد جب آئی ہم کو
شمع کے ساتھ جلے اور بڑھے

چاند کی کھوج میں کچھ ایسا ہوا
اپنی آنکھوں کو ملے اور بڑھے

تھک کے بیٹھے ہی نہیں آج تلک
دو قدم اور چلے اور بڑھے

اُن کو پانے کی لگن اور بڑھی
ہم بھی تاروں کے تلے اور بڑھے

منزلِ زیست میں ایسا بھی ہوا
کفِ افسوس ملے اور بڑھے

بات امجدؔ یہ تمہاری ہی نہیں
آگ میں دونوں جلے اور بڑھے

یاد جاناں ہے سسکتی شام ہے
لب پہ جاری بس اسی کا نام ہے

غافلوں کی کون کرتا ہے مدد
ہوشیاروں کا یہاں پر کام ہے

آج قاتل لگ رہا ہے مہرباں
دیکھئے اب کیا مرا انجام ہے

تیری نظروں کا ہے شائد یہ اثر
دل ہمارا تیرے زیرِ دام ہے

کون پوچھے گا یہاں فرقت کا حال
کس مصیبت میں ہماری شام ہے

عارضِ رنگیں سے ہے دل کو سکوں
چشمِ نرگس اک چھلکتا جام ہے

زندگی امجد ہماری یوں کٹی
دوستی اُلفت ہمارا کام ہے

نہیں کوئی آسان دل کا لگانا
سنبھل کر قدم اپنے آگے بڑھانا

مجھے جب سے قاصد نے مژدہ سنایا
ہیں بے چین نظریں تو دل ہے دوانا

نہ پوچھو کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے
لٹایا ہے میں نے جو دل کا خزانا

چلے آؤ بے خوف دل میں ہمارے
نہ ڈھونڈو خدارا نیا اک بہانا

مجھے خوفِ تنہائی ہرگز نہیں ہے
مرے ساتھ رہتا ہے ہر دم زمانہ

ادھر میکدہ ہے ادھر ایک دنیا
کہاں جا رہے ہیں کہاں پر ہے جانا

سر دارا مجید پہونچ تو گیا ہے
خدارا اسے آج تو ہی بچانا

آگ ایسی لگا کے رکھ دی ہے
دل کی دھڑکن بڑھا کے رکھ دی ہے

زندگی یوں سجا کے رکھ دی ہے
دل کی دنیا لُٹا کے رکھ دی ہے

دل جلایا ہے میں نے دانستہ
رونقِ شب بڑھا کے رکھ دی ہے

درد، نالے، فغاں، الم، آہیں
ہم نے محفل سجا کے رکھ دی ہے

میرے حصے میں سارے غم آئے
اجڑی بستی بسا کے رکھ دی ہے

اے شفق یہ کمال ہے تیرا
لب کی سرخی چرا کے رکھ دی ہے

ہو کے مجبور وقت کے ہاتھوں
دل کی حسرت اٹھا کے رکھ دی ہے

آنچ امجد جو ہم پہ آج آئی
اپنی گردن کٹا کے رکھ دی ہے

لمحوں میں زندگی میری آزار ہو گئی
ایک ایک سانس حلق پہ تلوار ہو گئی

پھیری نظر جو آپ نے طوفاں بپا ہوا
بیٹھے بٹھائے بات ہی دشوار ہو گئی

بربادیوں پہ رونے سے حاصل نہیں ہے کچھ
عزت کسی کی جب سرِ بازار ہو گئی

کالی گھٹا نے چھا کے بھرم رکھ لیا بہت
دیوار میکدے کی جو مسمار ہو گئی

شکوہ کریں تو کس سے شکایت سے فائدہ
تقدیر آج ہم سے ہی بیزار ہو گئی

دورِ خزاں ہی اپنا مقدر ہے دوستو
اور زندگانی غیر کی گلزار ہو گئی

امجد سکون چین ہی باقی نہیں رہا
دنیا عجیب حال سے دوچار ہو گئی

○

فریبِ نظر کے کرشمے ہیں کیا کیا
محبت کی دنیا میں دھوکے ہیں کیا کیا

بہاروں میں دل کا چمن لُٹ گیا ہے
مری زندگی میں یہ صدمے ہیں کیا کیا

یہ نفرت، عداوت یہ فرقہ پرستی
ملے دورِ حاضر کو تحفے ہیں کیا کیا

ہر اک آزمانے کو قوّت چلا ہے
بدلتے زمانے کے نقشے ہیں کیا کیا

یہ حسنِ مجسّم، اداؤں کا پیکر
ہر اک گام اس کے یہ چرچے ہیں کیا کیا

چمن کی فضا کا سنبھلنا ہے مشکل
یہاں حادثے روز ہوتے ہیں کیا کیا

غم و درد کی زد میں امجدؔ پھنسا ہے
زمانے میں اس کے بھی چرچے ہیں کیا کیا

ہم سے نظر ملائیے پر کچھ نہ پوچھیے
اپنا ہمیں بنائیے پر کچھ نہ پوچھیے

دھوکے سے ہٹ کے کیا ہے زمانے میں آج کل
دھوکا ضرور کھائیے پر کچھ نہ پوچھیے

قابل نہیں ہیں آپ خبر ہے ہمیں مگر
بس دار پر چڑھائیے پر کچھ نہ پوچھیے

یہ میکدہ ہے دیر و حرم تو نہیں کوئی
جام و سبو اٹھائیے پر کچھ نہ پوچھیے

وعدہ وفا نہ کرنا تو عادت ہے آپکی
وعدہ کبھی نبھائیے پر کچھ نہ پوچھیے

ڈر ہے اگرچہ آپکو دشمن سے جانِ جاں
خوابوں میں چل کے آئیے پر کچھ نہ پوچھیے

باقی رہے نہ دل میں وہ حسرت نکالیئے
اتنا مجھے ستائیے پر کچھ نہ پوچھیے

تڑپا کیئے ہیں آپ کے دیدار کے لئے
پردہ ذرا اٹھائیے پر کچھ نہ پوچھیے

امجدؔ سے پوچھ لیجئے جو کچھ ہے پوچھنا
میدان میں کھل کے آئیے پر کچھ نہ پوچھیے

مجبور آدمی کو ستایا نہ کیجیے
جلتے ہوئے کو اور جلایا نہ کیجیے

آنسو کو اس طرح سے بہایا نہ کیجیے
مانندِ شمع دل کو جلایا نہ کیجیے

دھوکے ہیں آپ غیر کے آنے سے فائدہ
دوری کو آپ اپنی بڑھایا نہ کیجیے

بے تاب ہو نہ جائیں یہ دیوانے آپکے
گھونگھٹ کو سر سے آپ اٹھایا نہ کیجیے

صدمے ہزار سہنے کا عادی ہوں میں مگر
بے وجہ دل کے زخم بڑھایا نہ کیجیے

مجبور جان کر ہی کرم آپ نے کیا
احسان کر کے آپ جتایا نہ کیجیے

دل کو سکون ملتا ہے اظہار سے حضور
ہر راز زندگی کا چھپایا نہ کیجیے

بچنا ہے چشمِ بد سے اگر آپ کو سدا
سُرخی شفق سے اور چرایا نہ کیجیے

اک بار ملنے آئیے خواہش ہے بس یہی
امجد کو آپ اتنا ستایا نہ کیجیے

فانی مسرّتوں کا اقرار کیا کریں گے
ہے زندگی غموں کا بازار کیا کریں گے

مکر و فریب سے جب ممکن نہیں نکلنا
ہو کر بھی اس جہاں میں ہشیار کیا کریں گے

جب سانپ آستیں میں پلنے لگے ہیں اپنی
آجائے ہاتھ میں گر تلوار کیا کریں گے

جب دل کی سرزمیں ہی ویران ہو گئی ہے
ویران جنگلوں کو گلزار کیا کریں گے

دل میں کسی کی خاطر جب کچھ جگہ نہ ہو گی
ایسے میں پیار کی ہم گفتار کیا کریں گے

چاہت میں ان کی لوگو تالے زبان پر ہیں
اقرار کیا کریں گے، انکار کیا کریں گے

جو بھی گذر رہی ہے اللہ شکر تیرا
مجبوریوں کا امجدؔ اظہار کیا کریں گے

ستم ظلم تیرا روا تو نہیں ہے
یہ معصوم بندہ بُرا تو نہیں ہے

ڈراتا ہے کیوں مجھ کو آنکھیں نکالے
تو ہوگا بہت کچھ خدا تو نہیں ہے

گل و خار پھر سے گلے مل رہے ہیں
گلستاں میں اب وہ فضا تو نہیں ہے

اٹھاتے ہیں سب انگلیاں ہم پہ لوگو
کہیں کچھ ہماری خطا تو نہیں ہے

نکل تو پڑا ہوں میں شوقِ جنوں میں
کہاں جاؤں گا یہ پتا تو نہیں ہے

اگر جی میں ہے تو پلا تھوڑی ساقی
ترے میکدے سے گلہ تو نہیں ہے

یہ مخمور آنکھوں سے ظاہر ہے امجد
سرِ راہ کوئی ملا تو نہیں ہے

○

وہ تو ہر وقت خفا ہوتے ہیں
پاس آتے ہیں جدا ہوتے ہیں

ہم پہ الزام تراشی ہی سہی
قرض ان کے تو ادا ہوتے ہیں

ہم نے دیکھی ہی نہیں ان کی وفا
بس جفاؤں پہ فدا ہوتے ہیں

پیاری پیاری سی ادا ہے ان کی
باتوں باتوں میں خفا ہوتے ہیں

جان آفت میں ہے سب کی ان سے
حسن والے بھی بلا ہوتے ہیں

رونے والے کو ہنسا دیتے ہیں
ہنسنے والے پہ خفا ہوتے ہیں

ان پہ انگلی نہ اٹھاؤ امجد
ان کے سب کام روا ہوتے ہیں

عشق کا جس کو مزہ لگتا ہے
وہ سدا غم میں گھرا لگتا ہے

یوں بظاہر وہ نہیں ہے اپنا
پیار آنکھوں میں چھپا لگتا ہے

وقت ایسا بھی کبھی آتا ہے
آدمی بھی تو خدا لگتا ہے

تہمتیں لوگ لگاتے ہیں بہت
ان سے بچنا بھی بُرا لگتا ہے

مجھ سے نفرت سہی یہ تو کہئے
اجنبی آپ کو کیا لگتا ہے

یاد آتی ہے تڑپ بڑھتی ہے
دور رہنا ہی بھلا لگتا ہے

اہلِ دنیا کی نظر میں امجد
میرا جینا بھی بُرا لگتا ہے

○

یہ زندگی کی دھوپ بھی ڈھلتی چلی گئی
منزل قریب آ کے بھی ٹلتی چلی گئی

کوئے بتاں کی یاد میں بڑھتے رہے سدا
ہر ہر قدم پہ راہ نکلتی چلی گئی

ان کی نوازشوں کا اثر یہ ہوا ضرور
حالت بگڑ بگڑ کے سنبھلتی چلی گئی

جب سے نظارا ان کا پھر اک بار ہو گیا
سوئی ہوئی حیات مچلتی چلی گئی

طاری تھا رعبِ حسن کہ نظریں نہ مل سکیں
یا رب ہماری جان نکلتی چلی گئی

مٹنا نہیں ہے حرفِ غلط کی طرح ہمیں
خود زندگی ہی راہ بدلتی چلی گئی

امجدؔ گناہ کا بھی تو کر لو ذرا حساب
اب عمر آپ کی بھی تو ڈھلتی چلی گئی

○

کیا پوچھتے ہو ہم سے ویرانیاں ہماری
آواز دے رہی ہیں تنہائیاں ہماری

آجاؤ ہوش میں تم سوتے رہوگے کب تک
لائیں ہمیں یہاں تک کمزوریاں ہماری

عزّت ہے ہاتھ تیرے تو ہی بچالے ہم کو
لٹنے لگی ہیں یارب خودداریاں ہماری

نظریں ملیں جو اُن سے یہ حال ہوگیا ہے
کچھ اور بڑھ گئی ہیں سرمستیاں ہماری

آتا ہے پیچھے پیچھے کس شوق سے زمانہ
کچھ کام آرہی ہیں دانائیاں ہماری

ان کے کرم کے صدقے دل شاد ہو رہا ہے
کام اپنے آگئی ہیں ناکامیاں ہماری

آئی ہے یاد پھر سے اس بے وفا کی امجد
بڑھنے لگی ہیں پھر سے بےتابیاں ہماری

بدلی جو نظر سب کی تیرا ہی اشارا ہے
جب تو ہی نہیں اپنا پھر کون ہمارا ہے

طوفان میں کشتی ہے ملاح بھی ڈرتا ہے
اللہ تیری مرضی اب تیرا سہارا ہے

وہ غم ہمیں دیتے ہیں یہ ان کی نوازش ہے
ہر ظلم و ستم سہنا یہ کام ہمارا ہے

رحمت کے بھروسہ پر کشتی ہے سدا اپنی
جب آن پڑی آفت تجھ کو ہی پکارا ہے

اب اہل گلستاں یوں گھورا نہ کرو ہم کو
گلشن کے سجانے میں خون کچھ تو ہمارا ہے

اغیار سے الفت ہے اپنوں سے نہیں رغبت
یہ طرز تمہارا بھی اب ہم کو گوارا ہے

ناکردہ گناہوں کی پاتے ہیں سزا لوگو
دنیائے محبت میں ہر چیز گوارا ہے

آنکھوں میں اتر آؤ اور دل میں سما جاؤ
انجان بنے کیوں ہو یہ اپنا اجارہ ہے

چھائی ہے گھٹا امجد موسم ہے بڑا دلکش
تو جام اٹھاؤ اب پینے کا اشارہ ہے

ملا مجھ کو کیا ہے ترے گھر سے ٹل کے
جگر خوں ہوا ہے ہر اک گام چل کے

تجھے دیکھ کر سکتہ طاری ہوا تھا
نظارا کیا میں نے آنکھوں کو مل کے

میں وحشی نہ دیوانہ اس پر بھی ہمدم
میرے پاس آنا مگر کچھ سنبھل کے

کہاں تھی ہمیں تابِ نظّارہ لوگو
ہر اک شب کٹی اپنی کروٹ بدل کے

کرم ان کا مجھ پر بڑا ہو گیا ہے
میرے گھر وہ آئے ہیں کانٹوں پہ چل کے

تڑپتا رہا اور مچلتا رہا میں
چلے وہ میرے دل کے ارماں کچل کے

تمنّائے جنت نہیں ہم کو امجد
کہ جیتے ہیں ہم ان کی باہنوں میں پل کے

○

خوابیدہ نگاہوں میں تنویر نظر آئی
روٹھی ہوئی صورت کی تصویر نظر آئی

دوری نے تری مجھ کو کچھ خواب دیئے ایسے
جلتے ہوئے شعلوں کی تعبیر نظر آئی

ماضی کا ہر اک گوشہ یادوں سے ابھر آیا
اس شوخ کی جب مجھ کو تحریر نظر آئی

تدبیر سرابوں میں ضم ہو کے رہی آخر
ہاتھوں کی لکیروں میں تقدیر نظر آئی

ہر حال میں جیتا ہوں، تنہائی کا غم پی کر
ہر موڑ پہ الٹی ہی تاثیر نظر آئی

یہ کیسی ہوائیں ہیں یہ کیسی فضائیں ہیں
حالات کی گردن پہ شمشیر نظر آئی

امجد کو ذرا دیکھو الجھا ہے جو ماضی سے
رستے ہوئے زخموں کی جاگیر نظر آئی

الجھے گیسو کی ہر اک گل نے سفارش کی ہے
روئے زیبا کو کچھ اس طرح نگارش کی ہے

کس پہ الزام دھریں کس نے یہ سازش کی ہے
مل کے اغیار سے اس نے جو نوازش کی ہے

نام کے ساتھ ترے، نام مرا بھی لکھنا
مرنے والے نے تو بس اتنی گذارش کی ہے

وقت کے ساتھ جو رہتے ہیں وہی پھلتے ہیں
ڈھلتے سورج کی بھلا کس نے پرستش کی ہے

ساقیا تیری عنایات ہیں میخانے پر
جام پر جام ملا جس نے بھی خواہش کی ہے

تجھ کو پانے کیلئے کتنے مصائب جھیلے
چاند تاروں کی طرح ہم نے بھی گردش کی ہے

کھا کے ٹھوکر میں گرا تھا، مجھے اتنا ہے خیال
یہ مجھے یاد نہیں، کس نے نوازش کی ہے

آنکھ ان سے جو ملی، اتنی خطا ہے یارو
ورنہ امجد نے بتاؤ کبھی لغزش کی ہے

آیا خیالِ یار تو آنکھیں چمک گئیں
دل ناچنے لگا ہے تو کلیاں چٹک گئیں

گُل کی رگوں سے خون ٹپکنے لگا ہے آج
ہونٹوں کا رنگ دیکھ کے نظریں بھٹک گئیں

جوشِ جنوں میں کچھ بھی دکھائی نہیں دیا
جتنی تھی خواہشیں وہ زباں پر اٹک گئیں

چھو کر صبا کے آنے کا، رنگین ثبوت ہے
وہ جس طرف بھی گذری ہے کلیاں مہک گئیں

وہ میرے پاس آئے تھے ملنے کے واسطے
دیکھا جو میں نے انکو تو نظریں بہک گئیں

جتنے بڑھے ہوئے تھے صداقت کے نام پر
سولی پہ ان کی گردنیں آخر لٹک گئیں

امجد کو جانے کیا ہوا خاموش ہے بہت
دل کیا بھٹک گیا کہ نگاہیں بھٹک گئیں

جب سے وہ میری رگِ جاں ہو گئے
زندگی کے ساز و ساماں ہو گئے

اک ہم ہی تھے بھٹکتے رہ گئے
جانے کتنے چاک داماں ہو گئے

لُٹ رہا تھا میں یہ میری بات تھی
جانے وہ کیوں اتنے حیراں ہو گئے

میرا ہر اک خواب ادھورا رہ گیا
وہ کسی کی راحتِ جاں ہو گئے

میں پریشانی سے گھبراتا نہیں
مفت میں کیوں تم پریشاں ہو گئے

جان سے بڑھ کر جنہیں چاہا سدا
ہائے وہ بھی دشمنِ جاں ہو گئے

کیا بھلا پائیں گے ان کو دوستو!
وہ بشیر امجد کا ارماں ہو گئے

○

اُن کو اپنا بنا کے پچھتائے
رسمِ الفت نبھا کے پچھتائے

وہ مناظر نظر سے گذرے ہیں
ان کی محفل میں جا کے پچھتائے

اپنا کچھ تو خیال تھا ان کو
حال اپنا سُنا کے پچھتائے

ہائے دیکھا جو حالِ زار اپنا
وہ بھی آنسو بہا کے پچھتائے

آگیا جب خیال توبہ کا
لب سے ساغر لگا کے پچھتائے

اک نظر بھی نہ ان کو دیکھ سکے
پاس اپنے بُلا کے پچھتائے

اپنا رونا تو عمر بھر کا ہے
پر انہیں بھی رُلا کے پچھتائے

جوشِ الفت میں اس طرح بہکے
رازِ الفت بتا کے پچھتائے

سامنا جب کبھی ہوا اس کا
چہرہ اپنا چھپا کے پچھتائے

عشق کی منزلیں ارے توبہ
اپنا سب کچھ لُٹا کے پچھتائے

کوئی اپنا نہ بن سکا امجد
عمر ساری گنوا کے پچھتائے

○

حادثوں سے روز ٹکراتے رہے
غم کے بادل زیست پر چھاتے رہے

حادثے تو روز و شب آتے رہے
ساتھ اپنے رنج و غم لاتے رہے

آسماں پر بادلوں کے سلسلے
میکشوں کو روز گرماتے رہے

والہانہ دور سے آئے مگر
پاس وہ آئے تو شرماتے رہے

قلبِ مُضطر کو سکوں حاصل کہاں
درد بن کر وہ جو تڑپاتے رہے

جام و مینا ہاتھ میں زاہد لئے
میکدے کو شام سے آتے رہے

کس قدر مایوس تھی یہ زندگی
ہر قدم مجھ کو وہ ٹھکراتے رہے

امتحاں اپنا سدا ہوتا رہا
دل کو ہم باتوں میں بہلاتے رہے

پیار امجدؔ ہم کو ظلمت سے رہا
روشنی چھائی تو گھبراتے رہے

آنہ جائے عذاب پردے میں
لُٹ نہ جائے شباب پردے میں

کوئی آئے نہ درمیاں اپنے
ہوگیا ہے حساب پردے میں

کیا ضرورت ہے بے نقابی کی
ہٹ رہا ہے حجاب پردے میں

قرب گر چاہتے ہو تم اپنا
رکھو دل کا حساب پردے میں

اب تو نظریں بھی چار ہوجائیں
آگئے ہیں جناب پردے میں

ساری الجھن سلجھ کے رہ جائے
پڑھ لو دل کی کتاب پردے میں

روشنی کو ترستی ہے دنیا
کب تلک یہ شباب پردے میں

کیوں نہ بڑھ جائے رونقِ گلشن
ہاں چھپا ہے گلاب پردے میں

یہ خوشی ہے کہ کوئی غم امجد
ہوگیا انتخاب پردے میں

بات میری بھی چل گئی ہوتی
شام غم کاش ڈھل گئی ہوتی

ان کی چشم کرم کے صدقے میں
ہر بلا آکے ٹل گئی ہوتی

اک دلاسا اگر ترا ہوتا
زیست اپنی بہل گئی ہوتی

تیری چاہت اگر نہیں ہوتی
میری چاہت بدل گئی ہوتی

وہ جو آتے تو بات بنتی تھی
موت بھی آکے ٹل گئی ہوتی

آپ کے پیار کا سہارا تھا
ورنہ دنیا بدل گئی ہوتی

کچھ تو سامانِ دید ہو جاتا
زلف شانوں پہ ڈھل گئی ہوتی

سب یہ کہتے ہیں مرگِ امجد پر
اس کی حسرت نکل گئی ہوتی

○

گھاؤ ایسا لگا گیا کوئی
کشمکش میں پھنسا گیا کوئی

پیار ایسا جتا گیا کوئی
غم کی دنیا بسا گیا کوئی

اہلِ دنیا یہ راز کیا جانیں
دل کی دھڑکن بڑھا گیا کوئی

سارا گلشن مہک مہک اٹھّا
دستِ نازک ہلا گیا کوئی

جانے سرزد ہوئی خطا کیسی
بے رُخی سے چلا گیا کوئی

حرفِ شکوہ زباں پہ کیا لائیں
ساری خوشیاں مٹا گیا کوئی

ہوش کی بات مجھ سے مت کرنا
جاتے جاتے پلا گیا کوئی

اس ادا سے اٹھا تھا محفل سے
ہوش سب کے اڑا گیا کوئی

لوگ امجد کو یاد رکھیں گے
خونِ ناحق بہا گیا کوئی

(۲)

تحریر ہے نہ اس کی تصویر ہی رہی ہے
آنکھوں میں اب ذرا سی تنویر ہی رہی ہے

بربادیوں نے ایسا نقشہ جما دیا ہے
باقی نہ اب تو گھر کی شہتیر ہی رہی ہے

کس سے کریں شکایت، شکوہ کریں تو کس سے
اگلی سی اب نہ اپنی تقدیر ہی رہی ہے

لے کر خوشی کریں کیا، جب دل ہی بجھ گیا ہے
بے وجہ دو دلوں کی تشہیر ہی رہی ہے

نیندیں حرام کرکے لئے جانے والے آجا
خوابوں کی اب نہ اگلی تعبیر ہی رہی ہے

حالاتِ حاضرہ سے تنگ آگئے ہیں یارو
ہر بات اب تو اپنی دلگیر ہی رہی ہے

امجد کی زندگی میں غم کے سوا رہا کیا
تدبیر ہے نہ باقی، توقیر ہی رہی ہے

○

ہر گھڑی پیار کی اک خواب نظر آتی ہے
دل کی حالت بڑی بے تاب نظر آتی ہے

ہائے کیا حال ہے دل ہو گیا محرومِ وفا
زندگی ماہیٔ بے آب نظر آتی ہے

جب سے سینے سے لگایا ہے غموں نے مجھکو
میری قسمت بڑی شاداب نظر آتی ہے

میری آنکھوں سے وہ سیلاب نکل آیا تھا
دل کی کشتی تہہ گرداب نظر آتی ہے

ہو سکے تو اسے بس اک نظارا دے دو
چشمِ نرگس بڑی بے تاب نظر آتی ہے

ان کی چاہت کو نہ منہ پھیر کے دیکھو امجد
زندگی کا وہ نیا باب نظر آتی ہے

بھولی یادوں کو جگانے کی ضرورت کیا ہے
اس قدر مجھ کو ستانے کی ضرورت کیا ہے

درد کو دل میں بسانے کی ضرورت کیا ہے
اک نیا گھاؤ لگانے کی ضرورت کیا ہے

کچھ تو قدرت نے کیا، کچھ تری سازش نے کیا
مجھ کو اب اور گرانے کی ضرورت کیا ہے

تم نے چاہا تھا جسے، وہ تو تمہیں مل ہی گیا
دار پر مجھ کو چڑھانے کی ضرورت کیا ہے

آپ نے ترکِ تعلّق جو کیا ہے ہم سے
فیصلہ اس کا سنانے کی ضرورت کیا ہے

ڈھلتے سورج کی طرح ڈھلنے لگی ہے الفت
دل کے زخموں کو دکھانے کی ضرورت کیا ہے

جو بھی کرنا تھا کیا غیر کی سازش سے مگر
پھر سے دل اپنا لگانے کی ضرورت کیا ہے

جس نے کھائی ہے قسم دور رہے گا مجھ سے
اب مجھے اس کو بلانے کی ضرورت کیا ہے

مجھ میں کیا بات نہیں ہے یہ بتاؤ مجھ کو
غیر سے ربط بڑھانے کی ضرورت کیا ہے

جو بھی ہونا تھا ہوا اس کو بھلا دو امجد
بارِ غم اور اٹھانے کی ضرورت کیا ہے

قطعہ

بے سہاروں کو سہارا چاہیئے
غم کی کشتی کو کنارا چاہیئے
مجھ کو امجد اس قدر غم دیجیے
ضبط کا اب جس کو یارا چاہیئے

--٭--

○

موسم بدل گیا ہے اک چھیڑ ہو گئی ہے
تقدیر لٹ گئی ہے تدبیر سو گئی ہے

یہ چاند اور ستارے ہیں بے قرار کتنے
سمجھائیں تم کو کیسے کیا چیز کھو گئی ہے

واقف ہو تم بھی لیکن خاموش ہو گئے ہو
داغوں کی روشنی میں تنویر سو گئی ہے

ماتم کدہ یہ دل ہے، ہوش و خرد بھی گم ہیں
بے تاب زندگی پر ہر چیز رو گئی ہے

یہ عارضی جہاں ہے، ہر سانس عارضی ہے
جانا تھا اس کو اک دن تب ہی تو کھو گئی ہے

فضل و کرم سے تیرے کچھ آس بن رہی ہے
نظریں جو اس نے پھیریں اک آہ ہو گئی ہے

ایسی فضا ہے چھائی اس سرزمیں پہ امجد
آپس کی تنگ چشمی جھگڑوں کو بو گئی ہے

اب خزاں آئے یا بہار آئے
میرے دل کو مگر قرار آئے

اتفاقاً جو تم کو یاد آئے
میری چاہت کا کچھ شمار آئے

جس طرف دیکھو ہُو کا عالم ہے
دیکھنا کس طرف بہار آئے

اس قدر آپ نے فریب دیئے
کیسے وعدوں پہ اعتبار آئے

خالی خالی ہے جام و مینا بھی
ان کی آنکھوں کا کچھ خمار آئے

اک خوشی ہے کہ دور رہتی ہے
غم مگر دل میں بار بار آئے

ہے یہی آس آج تک امجدؔ
میرے دل میں کبھی بہار آئے

درد میں ڈوبتے جلتے ہیں سفینے دیکھو
غم و اندوہ میں تپتے ہوئے سینے دیکھو

مفلسی، پیاس، تڑپ، بھوک، مصیبت، آہیں
دور نے بدلے ہیں کیسے یہ قرینے دیکھو

کیوں نہ روشن ہو سرِ شام درِ میخانہ
زاہدِ خشک چلے آئے ہیں پینے دیکھو

گرچہ طوفاں سے بچانا ہے سفینے کو تمہیں
بڑھ کے طوفان سے ہیں لوگوں کے سینے دیکھو

اصل میں کون تھا حقدار مگر کیا کہئیے
کس کے ہاتھوں میں چلے آئے نگینے دیکھو

نوکِ شمشیر پہ جینا ہے مزے لے لے کر
تم جری ہو تو دھڑکتے ہوئے سینے دیکھو

راس آئی نہیں امجد کو زمیں الفت کی
ڈھونڈتے پھرتے ہیں راحت کے دفینے دیکھو

ہم ان کی نظر میں سمائے ہوئے ہیں
انہی سے دِل اپنا لگائے ہوئے ہیں

خطاوار دنیا کی نظروں میں ہیں ہم
یہ گل تو کسی کے کھلائے ہوئے ہیں

ہمیں تھوڑا آرام کرنے تو دیجئے
زمانے کے صدمے اٹھائے ہوئے ہیں

یہ نفرت، حقارت، حسد اور غیبت
یہ پیڑ اپنے ہاتھوں لگائے ہوئے ہیں

ذرا آپ کی بزم میں بیٹھنے دیں
بڑی دور سے چل کے آئے ہوئے ہیں

نہ چھیڑ اس قدر ہم کو اے شام فرقت
کئی زخم ہم دِل پہ کھائے ہوئے ہیں

خوشی ہم کو ہرگز نہ راس آئی امجد
کہ ہر دَور میں غم ہی کھائے ہوئے ہیں

○

نہ میں تجھ سے نہ تو مجھ سے جُدا ہے
بتا اے زندگی پھر کیوں خفا ہے

لئے پھرتا ہے کب تک راہبر تو
کہیں منزل کا تجھکو بھی پتا ہے

شکایت کیا زمانے سے کریں ہم
مقدّر میں جو لکھّا تھا ہوا ہے

تیری آمد سے کیوں سہما ہے گلشن
ذرا تو ہی بتا کیا ماجرا ہے

بھرا رکھا ہے ہر اک جام ساقی
ہمارا جام کیوں ٹوٹا پڑا ہے

اگر رغبت نہیں ہے مجھ سے تجھ کو
بتا کیوں گھر ترا سونا پڑا ہے

میری تشنہ لبی کا ہے یہ عالم
تری یادوں کا ساغر پی لیا ہے

بڑی مشکل میں اب کٹتی ہے امجد
مری تنہائی کا ساتھی خدا ہے

○

چلو آج ان کو شعور آگیا ہے
محبت کی دنیا میں نور آگیا ہے

اداؤں کا ایسا تسلسل چلا تھا
کوئی سامنے بن کے حور آگیا ہے

نظر سے جو ساقی نے مجھ کو پلائی
قسم ہے خدا کی سرور آگیا ہے

ابھی کمسنی ہے وہ واقف ہی کیا ہیں
نہ جانے کہاں سے غرور آگیا ہے

محبت کے جذبے کی ہے حدِّ آخر
چلے بڑھ کے موسیٰ تو طور آگیا ہے

ہوا جب سے انصاف مفلوج لوگو
سرِدار ہر بے قصور آگیا ہے

ہے میخانہ مشکل ہے جانا۔ یہاں سے
یہ امجد بھی اب کتنی دور آگیا ہے

○

لبوں پر تبسم ہے رنجور ہیں
یہی تو محبت کے دستور ہیں

چلے آتے تم تک مگر کیا کریں
نگاہوں سے دنیا کی مجبور ہیں

طلوعِ سحر بھی چلی شام سے
غموں کے سمندر میں ہم چور ہیں

گھٹا کالی کالی ہے چھائی ہوی
لڑائی میں سب دیس محصور ہیں

منازل کا طے کرنا آساں نہیں
بڑے فاصلے ہیں، بہت دور ہیں

ترا میکدہ بھی نرالا رہا
سبھی تشنہ لب ہیں جو مخمور ہیں

کوئی جا کے امجدؔ کو سمجھا تو دے
بلا وجہ کیوں آپ مہجور ہیں

جلنے لگا ہے گھر جہاں گھر کے چراغ سے
شکووں کا کیا محل ہے وہاں دل کے داغ سے

یہ اتّفاق بھی تو بڑا خوشگوار ہے
ٹکرا گیا دماغ تمہارے دماغ سے

یہ اور بات ہے کہ سبھی سرفراز ہیں
کچھ بھی نہیں ملا ہے ہمیں اپنے باغ سے

دل اپنا کب کے کھو گیا یہ تو بُرا ہوا
اتنا پتا چلا ہے ہمارے سُراغ سے

شائد ہوائے وقت نے گل کر کے رکھ دیا
گھر ہو گئے ہیں کتنے ہی اب بے چراغ سے

غیروں سے اب بتائیے کیا خاک ہو گِلہ
پتھر جو آرہے ہیں خود اپنے ہی باغ سے

کانٹوں کی طرح کرتے ہیں برتاؤ دوستو
لاؤ نہ پھول اب کوئی امجد کے باغ سے

ڈوب کر غم میں کچھ ایسے کھو گئے
دل کے سب بیدار جذبے سو گئے

زندگی کے داغ گہرے تھے مگر
دھونے والے آنسوؤں سے دھو گئے

غم، ستم، رنج و الم، آہ و فغاں
بس یہی اسباب اپنے ہو گئے

جس نے چاہا ہم کو روندا خوش ہوا
وقت کے مجمع میں ہم یوں کھو گئے

زندگی قابو سے باہر ہو گئی
بیج وہ افکار کے یوں بو گئے

وہ خوشی کی گود میں پلتے رہے
اور ہم، غم کے حوالے ہو گئے

سب کے سب امجد مزے میں تھے مگر
درد کی آغوش میں ہم سو گئے

○

نظر ہر وقت آتے ہیں خفا سے
خدا بخشے مجھے ان کی جفا سے

خطا ان کی نظر آتی نہیں ہے
انہیں تو ہے غرض میری خطا سے

ہے جتنا خوف فرقت کا تمہاری
نہیں ہے ڈر مجھے اتنا قضا سے

گزرتا کون ہے دل سے نہ جانے
مچی ہلچل سی ہے آواز پا سے

مقدر کیوں ہمارا ہے بھیانک
یہی تو پوچھنا ہے اب خدا سے

گدا پر تم نہ یوں آنکھیں نکالو
یہ شیوہ دور ہے شان عطا سے

یقیں مشکل ہے باتوں پہ تمہاری
نہ دو امجد کو تم جھوٹے دلاسے

کچھ ایسا دورِ نازک آ رہا ہے
چمن کو باغباں خود کھا رہا ہے

نہ جانے کونسی منزل میں ہیں ہم
اجالوں پر اندھیرا چھا رہا ہے

ہیں زنگ آلود آئینے دلوں کے
خرد کا رنگ اڑتا جا رہا ہے

کوئی لمحہ تجھے بھولا نہیں ہوں
مگر تو ہے کہ بس تڑپا رہا ہے

ترے حسنِ مجسّم کی قسم ہے
شفق کا رنگ اڑتا جا رہا ہے

بھلائی کی توقّع کس سے رکھیں
جہاں پر نفس خود جھٹلا رہا ہے

بشیر امجد ہوس سے باز آؤ
کہ اب جینے میں باقی کیا رہا ہے

چہرہ نقاب میں ہے محفوظ یہ زمین ہے
اٹھ جائے یہ اگر تو ہر ذرّہ آتشیں ہے

الفت اگرچہ اپنی افسانہ بن گئی ہے
لیکن تمہارا غم ہے، جواب بھی دلنشیں ہے

عقل و خرد بھی تھک کر اب ماند پڑ گئے ہیں
ہم ڈھونڈتے کہیں ہیں، اس کا پتا کہیں ہے

بے چین ہوں میں ہر دم، بے تاب ہوں میں ہر دم
دل لے گیا ہے کوئی اتنا مجھے یقیں ہے

تیور بدل گئے ہیں حالات بھی الگ ہیں
انداز جو تمہارا، پہلے تھا اب نہیں ہے

آنکھوں میں بس گیا ہے جب سے تمہارا چہرہ
دل اور جگر پہ قابو، ہرگز مجھے نہیں ہے

امجد نے جستجو میں، دنیا کی خاک چھانی
آنکھیں کھلیں، تو دیکھا، وہ دل میں جاگزیں ہے

نگاہِ ناز کا جادو سحر میں رہتا ہے
جنونِ عشق کا سودا تو سر میں رہتا ہے

گلوں سے بات کی صحرا کی خاک بھی چھانی
سکون چین تیری رہگذر میں رہتا ہے

یہاں تو شمع بھی جلتی ہے دل بھی جلتے ہیں
مزہ تو جلنے کا برق و شرر میں رہتا ہے

یہ کیسا ربط ہے اور کیسی کیفیت یارو
جو درد دل میں اٹھے چشمِ تر میں رہتا ہے

ہزار دور رہے تو ہماری نظروں سے
جہاں کہیں بھی رہے تو نظر میں رہتا ہے

اگر ملے بھی تو وہ کس طرح زمیں پہ ملے
چلے تھے ڈھونڈنے جس کو قمر میں رہتا ہے

نہ اب وہ دل کی ہے رونق نہ شان ایواں کی
مکیں ہی جب نہ ہو پھر کون گھر میں رہتا ہے

نہیں ہے فکر جدائی کی اب مجھے امجد
وہ میرے ذہن میں دل میں نظر میں رہتا ہے

○

جدائی میں اشکوں کا دریا رواں ہے
بہاروں کے بدلے یہ آئی خزاں ہے

بھلا نیند آئے یہ ممکن کہاں ہے
تمام آہٹوں پر اسی کا گماں ہے

تصوّر بھی ممکن نہیں میکدے کا
نہ جام و سبو ہے، نہ کوئی نشاں ہے

گِلہ مجھ کو بیتے دنوں کا نہیں ہے
یہ کیا کم ہے اب وہ مرے درمیاں ہے

پتہ اس کا تو مجھ کو ملتا نہیں ہے
کمندِ مقدّر بھی ٹوٹا کہاں ہے

نظر جب جھکی تھی تو مایوسیاں تھیں
نظر اب اٹھی ہے تو صرف آسماں ہے

روش پر کبھی اپنی امجدؔ نہ خوش ہو
جو ہے زندگی تیری سب پر عیاں ہے

گنگا کی روانی ہے آنکھوں میں جوانی ہے
یہ دیس ہمارا ہے، بھارت کی کہانی ہے

اسلاف کی باتوں کو گن گن کے بتاؤں گا
جو بات اصولی ہے وہ کر کے دکھانی ہے

زلفوں کے سنوارنے میں کچھ دیر تو لگتی ہے
ہر حال میں یہ محفل تم کو ہی سجانی ہے

دشمن کی نہ پروا کر اقدام تو اپنا کر
مجبور جو ہو جائے تلوار اٹھانی ہے

یہ دیس ہمارا ہے جس پر ہے فدا ہر اک
لٹ جائے اگر جان بھی عزت تو بچانی ہے

یہ کوہِ ہمالہ ہے رکھتا ہے نشاں اونچا
یہ دیس بھی اونچا ہے، اونچی یہ نشانی ہے

امجد کو ذرا دیکھو پستی میں بھی اونچا ہے
ہر اک کی زباں پر اب اس کی ہی کہانی ہے

راز الفت کا زمانے سے چھپایا جائے
آہ کو سینے میں دانستہ دبایا جائے

زندگی خواب ہے اس خواب کی تعبیر ہے کیا
فلسفہ یہ نہ، زمانے کو بتایا جائے

بے رخی ان کی پریشان کیا کرتی ہے
بارِ غم دوستو، کب تک یہ اٹھایا جائے

بزمِ اغیار سے اب آپ کو فرصت ہی کہاں
دیکھئے ہم کو بھی پلکوں پہ بٹھایا جائے

یہ الگ بات کہ ہم ضبط کیا کرتے ہیں
حد سے بڑھ کر بھی کسی کو نہ ستایا جائے

غم و اندوہ بلا، آہ و فغاں، رنج و الم
بس انہیں رنگوں سے اب دل کو سجایا جائے

دوست کہتے ہیں جسے اب نہیں باقی امجد
ہاتھ دشمن سے سمجھتا ہوں ملایا جائے

زندگی میں مرحلے کچھ اس قدر آتے رہے
زہر کو امرت سمجھ کر روز پی جاتے رہے

بے رخی، بے اعتنائی تھی دکھانے کے لئے
جب ہمارا ذکر آیا کیوں وہ شرماتے رہے

مرحلہ ان کی تبسم تک ہی آکر رہ گیا
پیار کچھ اتنا بڑھا وہ ہم سے کتراتے رہے

جستجو میں منزلِ مقصود کی آگے بڑھے
ہم جہاں پہنچے وہاں سب ہم کو ٹھکراتے رہے

مرنے والا مرگیا، پرساں نہ تھا اس کا کوئی
رونے والے کچھ کرائے کے مگر آتے رہے

چال سے بچکر عدو کی ہم تو نکلے تھے مگر
راہرو تیری گلی کے خوب بہکاتے رہے

یوں غموں کے بوجھ نے امجد کو مردہ کر دیا
قافلے زخموں کے بڑھکر اسکو تڑپاتے رہے

ہر حال میں خوش ہوں مجھے انکار نہیں ہے
یہ بات الگ ہے ترا دیدار نہیں ہے

ہم دونوں میں اب تک کوئی تکرار نہیں ہے
اک ربط ہے جو قابلِ اظہار نہیں ہے

ظالم سہی لیکن وہ دل آزار نہیں ہے
ملتا ہے سلیقے سے وہ بیزار نہیں ہے

آلام و پریشانی کا، کچھ غم نہیں مجھ کو
دشوار مرے واسطے دشوار نہیں ہے

یہ تیرا کرم، تیری عنایت ہی سمجھ لے
جو زخم مرے دل پہ ہے، وہ بار نہیں ہے

حالات زمانے کے بھلا کیسے سدھرتے
سب نام کے انسان ہیں کردار نہیں ہے

ہر ایک کا بار اپنے جو کاندھوں پہ اٹھاتا
امجدؔ بھی تو ایسا کوئی زردار نہیں ہے

بربادی کے ہیں سامان آغازِ محبت سے
دن یونہی گذرتے ہیں آلام و مصیبت سے

آنکھوں کی چمک ان کی مسرور تو کرتی ہے
ناسور بنا ہے دل بس ان کی شرارت سے

جینے میں نہیں لذّت، مرنے کی نہیں فرصت
آتے ہیں نظر مجھ کو آثار قیامت سے

ہم ان کی بدولت ہی جب دار تلک آئے
آنکھوں میں لیئے آنسو آئے وہ ندامت سے

اندازہ لگا لو تم اب میری تباہی کا
بگڑی ہوئی صورت سے بدلی ہوئی حالت سے

اوروں کی طرف بڑھ کر کیا ہاتھ میں پھیلاؤں
ملتا ہے بہت مجھ کو مالک تیری رحمت سے

گر آپ نہ چاہیں تو اب کون ہے امجدؔ کا
صدمے ہی ملے اس کو بس آپ کی فرقت سے

جو دل پہ گزرتی ہے تم اس کو سنا دینا
انجام محبت کا دنیا کو بتا دینا

کردار زمانے کا اس موڑ پہ لایا ہے
فتنوں کو ہوا دینا آپس میں لڑا دینا

اے فضل و کرم والے اک بار مری سن لے
طوفان میں کشتی ہے ساحل سے لگا دینا

اظہار محبت کی یہ بھی تو نشانی ہے
آنسو جو گرے اس کے دامن میں چھپا دینا

یہ دل بھی تمہارا ہے، یہ جاں بھی تمہاری ہے
چاہو تو ہنسا دینا، چاہو تو رُلا دینا

ہر راہ حقیقت میں لازم ہے یہی لوگو
تم بات صداقت کی دنیا کو بتا دینا

گر جان ہی لینا ہے، آساں یہ طریقہ ہے
گھونگھٹ کو ذرا اپنے چہرے سے ہٹا دینا

اس طرح سے چھپ چھپ کر بھاگا نہ کرو مجھ سے
اک بار ذرا آ کر صورت تو دکھا دینا

امجدؔ تمہیں لازم ہے آہستہ بڑھو آگے
ہیں پھول بھی راہوں میں ٹھوکر نہ لگا دینا

حالاتِ زندگی نے مجبور کر دیا ہے
ہر لمحہ حادثوں نے رنجور کر دیا ہے

گل شمع ہو گئی ہے بڑھنے لگا اندھیرا
دل کو جلا کے شب کو پر نور کر دیا ہے

اوروں نے بڑھ کے لوگو مجھکو گلے لگایا
اپنوں نے بے رخی سے جب دور کر دیا ہے

لے کر چمن کریں کیا، ماحول کیا، فضا کیا
حالات نے کچھ ایسا مجبور کر دیا ہے

انجام ڈھونڈتے ہو اچھا ملیگا کیسے
لوگوں کو مال و زر نے مغرور کر دیا ہے

جیسا تھا جسقدر تھا بس سامنے تھا سب کے
چہرے کو جانے کس نے پر نور کر دیا ہے

دیکھا نہیں تھا ہم نے امجد کو سر جھکاتے
اتنا بتاؤ کس نے مجبور کر دیا ہے

کس لئے مفت میں اتنی مری رسوائی ہے
اک نئے موڑ پہ اب زیست چلی آئی ہے

اک تصوّر ہے جو ہر وقت لگا رہتا ہے
شہر میں رہ کے بھی تنہائی سی تنہائی ہے

جانے کیا بات ہے اٹھتی نہیں نظریں اپنی
آپ کے حسن نے تابش ہی بڑی پائی ہے

ساقیا تو ہی بتا کیا ہو مقدّر اپنا
تشنگی اوج پہ ہے اور گھٹا چھائی ہے

آپ آتے نہیں یہ بات الگ ہے لیکن
شکر ہے آپ سے مدّت کی شناسائی ہے

پھول یادوں کے، گہر اشکوں کے، ماضی کی کسک
زندگی میرے لئے ڈھونڈ کے کیا لائی ہے

کون امجد پہ عنایت کی نظر کرتا ہے
زور باقی ہے نہ زر ہے نہ توانائی ہے

تھک ہار کے بیٹھا ہوں کیوں مجھ کو ستاتا ہے
جس راہ میں کانٹے ہوں کیوں مجھ کو بلاتا ہے

ہر گام نئی منزل ملتی ہے تجھے ناداں
کیوں وقت کی زلفوں کو ناحق تو سجاتا ہے

جو بات ہے اپنوں میں غیروں میں کہاں ہو گی
کیوں دل کے جلانے کو غیروں کو بلاتا ہے

ساقی ترا میخانہ تجھ کو ہی سلامت ہو
صد شکر مجھے کوئی نظروں سے پلاتا ہے

سجدے کا مزہ پانے سجدے کو سمجھ پہلے
جب دل ہی نہیں مائل کیوں سر کو جھکاتا ہے

کیا میں نے خطا کی ہے کیا بھول ہوئی مجھ سے
مدت ہوئی اب تک وہ آتا ہے نہ جاتا ہے

کس سوچ میں ڈوبے ہو بے خوف چلے آؤ
محفل میں کوئی امجد اب تم کو بلاتا ہے

ظلم و ستم روا ہے اگر آپ مان لیں
میری یہی سزا ہے اگر آپ مان لیں

اجڑے چمن میں آپ چلے آئیں ایک بار
ہر غنچہ کہہ رہا ہے اگر آپ مان لیں

آکر ذرا ہٹائیے، شائد سکون ملے
ساتھ اپنے ہر بلا ہے اگر آپ مان لیں

زلفوں کا ایک بار سہارا تو دیجیئے
ہر گام حوصلہ ہے اگر آپ مان لیں

چشم کرم جو آپ کی ہو جائے گی ادھر
ہر غم کا آسرا ہے اگر آپ مان لیں

آپ آئیں میرے گھر کو تو کچھ بات بھی رہے
گردش کا سلسلہ ہے اگر آپ مان لیں

چھٹ جائیں گے اندھیرے، ہٹا لیں نقاب کو
سب کے لئے بھلا ہے اگر آپ مان لیں

امجد کے دل میں آپ سے ہٹ کر کوئی نہ ہو
اس کی یہی دعا ہے اگر آپ مان لیں

○

کس نرالے ڈھنگ سے دہ کر گیا دیوانہ آج
سب کی نظروں میں حقیقت بن گئی افسانہ آج

دوستی کیسی، محبت شئے ہے کیا، کس کو خبر
ناز تھا جس پر ہمیں، وہ بن گیا بیگانہ آج

کر گئے گھائل ہمیں، وہ عشوہ و ناز و ادا
دل بھی کیا نادان ہے جو بن گیا دیوانہ آج

غم زدہ ہوں مجھکو مت چھیڑو کہ میں خاموش ہوں
پھر چھلک جائے نہ میرے درد کا پیمانہ آج

اس سے بڑھ کر اور نذرانہ کہاں سے لاؤں گا
اپنا دل لایا ہوں ان کے واسطے نذرانہ آج

جام ہیں خالی، سبھی میخوار ہیں سہمے ہوئے
ساقیا کیا ہو گیا، کیوں ایسا ہے میخانہ آج

ہوش میں آیا ہوں امجدؔ کس قدر مشکل سے میں
وہ نظر پھر سے نہ کر ڈالے مجھے مستانہ آج